قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1961ء

IN MEMORY OF THE QUAID

"Every Musalman knows that the injunctions of the Quran are not confined to religious and moral duties. 'From the Atlantic to the Ganges', says Gibbon, 'the Quran is acknowledged as the fundamental code, not only of theology but of civil and criminal jurisprudence, and the laws which regulate the actions and the property of mankind are governed by the immutable sanctions of the will of God'. Everyone, except those who are ignorant, knows that the Quran is the general code of the Muslims. A religious, social, civil, commercial, military, judicial, criminal penal code; it regulates everything from the ceremonies of religion to those of daily life, from the salvation of the soul to the health of the body, from the rights of all to those of each individual, from morality to crime, from punishment here to that in the life to come, and our Prophet (ؐ) has enjoined on us that every Musalman should possess a copy of the Quran and be his own priest. Therefore, Islam is not confined to the spiritual tenets or doctrines and rituals and ceremonies. It is a complete code regulating the whole Muslim society, every department of life, collective and individual."

(Quaid-e-Azam's Eid Message to the Nation in 1945)

شائع کردہ:

طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

حق باری تعالیٰ کے سوا

رابطہ باہمی

مسلمان بچوں کی تربیت

نقد و نظر

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام (لاہور)

ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
۷۵۰۰	ہند و پاکستان سے	ہندو پاکستان سے سالانہ - آٹھ روپے
خط و کتابت کا پتہ	بارہ آنے	غیر ممالک سے ۱۶ شلنگ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ - لاہور		

جلد ۱۴	جنوری ۱۹۶۱ء	نمبر ۱

فہرستِ مضامین

لمعات		۲
پاکستان کی کہانی		۱۳
قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل		۳۱
قائدِ اعظم کی مخالفت		۴۲
قائدِ اعظمؒ	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۹
ہستی باری تعالیٰ کے شواہد و ثبوت	(ڈاکٹر کریسی ماریسن)	۵۷
رابطہ باہمی		۶۵
مسلمان بچوں کی تربیت		۷۳
نقد و نظر		۷۹

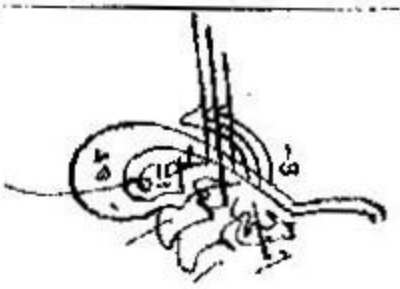

لمعات

تحفظِ ناموسِ رسالت

ہم مدت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام دنیا کے سامنے، اپنی حقیقی منزہ از شائبہ شکل میں پیش ہو، تو اس سلسلہ میں سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے قدیم مذہبی لٹریچر کا از سر نو جائزہ لیں اور اس میں باتیں ایسی ہوں جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہوں یا جن سے حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم یا صحابہ کرامؓ کی شان کے خلاف کسی قسم کا طعن پایا جائے، انہیں ان کتابوں سے نکال دیا جائے۔ ان کتابوں سے ہمارا مطلب دوسرے اور تیسرے درجہ کی کتابیں نہیں۔ ان سے مراد وہ درجہ اول کی کتابیں ہیں جنہیں ہم بطور سند پیش کرتے ہیں ..... خواہ وہ کتب احادیث ہوں یا سیر۔ تاریخ ہوں یا تفاسیر ---- ان کتابوں کی تالیف و تصنیف، انسانی کوششوں کا نتیجہ تھی اور کوئی انسانی کوشش منزہ عن الخطا قرار نہیں دی جا سکتی۔ نہ ہی اس بات سے کسی انسان کی عظمت یا بزرگی میں کچھ فرق آ جاتا ہے کہ اس کی فلاں کتاب میں فلاں بات صحیح نہیں لیکن جب ہم اس کتاب کو دین کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں تو وہ غلطی اس مصنف یا مؤلف کی غلطی نہیں رہتی، خود دین کا سقم بن جاتی ہے اور اس طرح اسے بُری طرح داغدار کر دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے فروری ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں خاص طور پر لکھا تھا کہ

دل آزار کتابیں

آج کل اخبارات میں، بعض دل آزار مذہبی کتابوں کا عجیب و غریب سرخیوں کے ساتھ چرچا ہو رہا ہے جو یوں کہ کسی صاحب نے ایک کتاب شائع کر دی جس سے ایک طبقہ کے جذبات مجروح ہوئے۔ اس کے جواب میں اس طبقہ کی طرف سے (ایک کے مقابلہ میں چار) کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو اس کتاب سے کہیں زیادہ دل آزار اور منافرت انگیز ہیں۔ اس پر صلح پسند طبقہ کی طرف سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں

کہ اس سلسلہ کو ختم کیا جائے۔

دل آزار کتابوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ کچھ آج کی پیداوار نہیں۔ یہ عرصہ سے جاری ہے۔ ان کے خلاف جس شدت سے بھی صدائے احتجاج بلند کی جائے وہ برحق اور قابلِ فہم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح صدائے احتجاج بلند کرنے سے یہ سلسلہ رک سکتا ہے؟ اس سلسلہ کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ سطح سے ذرا نیچے اتر کر ان سرچشموں کو تلاش کیا جائے جہاں سے اس قسم کی کتابوں کو جنم ملتا ہے۔

آپ ان کتابوں کو دیکھئے۔ رجز مستثنیات جن میں مصنف نے کچھ اپنی طرف سے لکھا ہو) ان میں اکثر و بیشتر ان کتابوں کے اقتباسات ہوتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم تک منتقل ہو کر آئی ہیں ہم اسلاف کی ان کتابوں کو اپنے کتب خانوں کی زینت بناتے ہیں۔ ان کی نشر و اشاعت کو کارِ خیر سمجھتے ہیں۔ اس کارِ خیر میں ہزاروں۔ لاکھوں روپیہ صرف کرتے ہیں مکتبوں اور دار العلوموں میں ان کا درس دیتے ہیں محفلوں اور مجلسوں میں ان کے چرچے کرتے ہیں۔ منبر و محراب سے ان کے تذکرے سنائی دیتے ہیں لیکن جب کوئی شخص انہی کتابوں میں سے مواد جمع کر کے نئی کتاب شائع کر دیتا ہے تو اس کے خلاف شور و غوغا بلند کرنا شروع کر دیتے ہیں کہیں کتاب کو ضبط کرنے کے ریزولیوشن پاس ہوتے ہیں کہیں مصنف کے خلاف کارروائی کرنے کے مشورے دیئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ معاشرہ میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے جو اکثر و بیشتر اس کتاب کی ضبطی پر منتج ہوتا ہے۔

اس کتاب کو تو ہم ضبط کرا دیتے ہیں لیکن جن کتابوں کے اقتباسات پر وہ کتاب مشتمل تھی، ان کی نشر و اشاعت کا "کارِ خیر" بدستور جاری رہتا ہے، سوچئے کہ کیا اس طرح، اس قسم کی کتابوں کا سلسلہ ختم ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی کتاب اپنے مندرجات کی بنا پر قابلِ ضبطی ہے تو وہ کتابیں قابلِ ضبطی کیوں نہیں جن سے وہ اقتباسات لئے گئے ہیں؟ کیا وہ محض اس لئے قابلِ ضبطی نہیں کہ وہ آج سے دو چار سو سال پہلے لکھی گئی تھیں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات اصل کتاب کا کوئی مضمون فی ذاتہٖ قابلِ اعتراض نہ ہو لیکن اس کے اقتباس کو غلط انداز میں پیش کیا گیا ہو لیکن یہ بھی مستثنیات میں سے ہوگا۔ اکثر و بیشتر وہ اقتباسات بجائے خود قابلِ گرفت ہوں گے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اس قسم کی جدید کتابوں کے خلاف واویلا مچایا جائے) ان پرانی کتابوں کو کنگھالا جائے اور ان میں جو چیزیں قابلِ اعتراض ہوں (خواہ وہ کسی فرقے سے متعلق ہوں) انہیں خارج کر دیا جائے یا ان کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے جس طبقہ کا معاش ہی اس قسم کی ہنگامہ خیزیوں سے وابستہ ہو اور جس کا دین "فی سبیل اللہ فساد" ہو وہ ان کتابوں کو ہاتھ کب لگانے دے گا؟ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہوگا؟ جب بھی وجود میں آگئی ضرور ایسا کرے گی۔

اس شذرہ کی اشاعت کے بعد ہمارے پاس متعدد گوشوں سے خطوط اور پیغامات آئے جن میں کہا گیا تھا کہ ہمیں اس سلسلہ میں مزید سلسلہ جنبانی کرنی چاہیے لیکن ہم چاہتے تھے کہ اس قسم کی تحریک انفرادی طور پر سامنے آنے کی بجائے، اجتماعی طور پر پیش ہو۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ اس میں بھی زیادہ توقف نہ ہوا۔ (حقیقت یہ ہے کہ اب زمانے کے تقاضے ہمیں مجبور کر کے اس طرف لا رہے ہیں) شروع دسمبر میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں ایک نشست حضور رسالت مآبؐ کی سیرت طیبہ کے تذکار جلیلہ کے لئے مخصوص تھی۔ اس نشست کی صدارت، سپریم کورٹ کے (سابق) جج جسٹس محمد شریف صاحب (چیئرمین سابق اسلامک لاء کمیشن، ویسٹ پاکستان آئین کمیشن) نے فرمائی۔ اس سلسلہ میں جو روئیداد اخبارات میں شائع ہوئی ہے اس کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے :-

> مولانا غلام مرشد نے علمائے اسلام کی اس فروگذاشت پر کڑی نکتہ چینی کی کہ بعض ایسی ضعیف روایات ہمارے اسلامی لٹریچر میں اب بھی موجود ہیں جن سے نبی اکرمؐ کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے حتیٰ کہ حضور پاکؐ کی ازواج مطہراتؓ پر نمایاں حملوں کا مواد ہماری کتابوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس بے ادبی کا باعث اور بدطینت نقادوں کے مواخذ کو حذف کرنا حضور نبی کریمؐ سے محبت کا تقاضا اور اُن کی غلامی کا اولین حق ہے۔ آپ نے مزید کہا رسول پاکؐ کی تکریم کے لئے اُن روایات کو مسترد کر دینا چاہیے جو کسی بھی طرح حضورؐ کی سیرت طیبہ کو مسخ صورت میں پیش کرتی ہیں۔
>
> انجمن کے صدر مولانا غلام محی الدین قصوری نے پیشکش کی کہ وہ علمائے پاکستان کو اس مقصد کے لیے کام کرنے کی دعوت دیں گے۔ اور پاکستان سے باہر بھی لائبریریوں میں محفوظ اسلامی لٹریچر میں سے اُن روایات کی نشان دہی کی جائے گی جو اسلام کے بدخواہ بہتان لگانے کی غرض سے بالعموم استعمال کرتے ہیں۔ درونِ مُلک ایک تحریک پیدا کر کے اپنے علمی ذخیرہ کو توہین آمیز مواد سے پاک کیا جائے گا۔ انجمن حمایت اسلام اس مقصد کے لئے روپیہ صرف کرے گی کہ سیرت حضور اکرمؐ پر مستند لٹریچر شائع کیا جائے۔
>
> (بحوالہ نوائے وقت۔ مورخہ ۴ ردسمبر ۱۹۶۰ء)

اس مبارک و مسعود تحریک کا ہر اس گوشے سے بدل استقبال ہوا جو حضور رسالت مآبؐ کی عظمت و توقیر کو باعث تقویت ایمان اور وجہ سعادتِ دارین سمجھتا ہے لیکن آپ یہ معلوم کر کے متعجب اور متاسف ہوں گے کہ ہماری بدنصیب قوم میں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جنہیں یہ تحریک بھی بے حد ناگوار گذری ہے اور وہ اس کی مخالفت کے لئے میدان میں اُتر آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ یحسبون کل صیحۃ علیھم (۶۳/۴) کہیں پتہ بھی کھڑکے تو ان کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے کہ کوئی اور آفت ہم پر آئی۔ چنانچہ (سابق) جماعت اسلامی کے نقیب ہفتہ وار ایشیا (جس کے مدیر نصر اللہ خان صاحب عزیز ہیں) کی ۲۰ ردسمبر کی اشاعت میں "مرض تشکیک" کے

بیماریوں سے" کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے۔ ہم اس مقالہ کو (اس کی طوالت کے باوجود) بہ تمام و کمال درج ذیل کرتے ہیں تاکہ اس نازک ترین مسئلہ سے متعلق، اس گروہ کی پوری بات قارئین کے سامنے آجائے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

بیان کیا گیا ہے کہ عالمگیری مسجد (لاہور) کے خطیب مولانا غلام مرشد نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے علمائے اسلام کو توجہ دلائی کہ اسلامی لٹریچر میں کچھ ایسی روایات راہ پا گئی ہیں جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بے ادبی ہوتی ہے۔ اور مستشرقین ان کو سند بنا کر اسلام کے خلاف اعتراضات کرنے کا موقع حاصل کرتے ہیں۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ ان روایات کو اسلامی لٹریچر میں سے حذف کر دینا چاہیئے۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ جب مولانا غلام مرشد اس قسم کا مشورہ دے رہے تھے تو وہ ہوش و حواس میں تھے یا ماحول کی سکندر اگبیری نے ان پر نشے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس امر سے قطع نظر کہ اس قسم کے کسی اقدام کی ضرورت بھی ہے یا نہیں سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک علمی مسئلہ ہے، جسے اہلِ علم کی کسی مجلس میں بیان کیا جانا چاہیئے یا کہ یہ ایک عوامی مسئلہ ہے جسے عوام کی حمایت حاصل کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک علمی مسئلہ ہے اور انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہرگز اس کے تذکرے کے لئے موزوں نہیں تھا اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی آڑ میں انکارِ حدیث کے فتنے کی حمایت کی جائے۔ بے چارے عوام کو کیا معلوم کہ اسلامی لٹریچر میں جن عیوب و نقائص کی نشان دہی کی جا رہی ہے اُن کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اور مستشرقین کے اعتراضات کا ہدف ضعیف روایتیں نہیں بلکہ خود اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے۔ یورپ کے پادریوں اور یہودی عالموں نے اسلام پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اس لئے نہیں کہ ان اعتراضات کا کوئی محل ہے۔ بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ مسیحی اقوام کو ملتِ اسلامیہ کے خلاف اشتعال دلایا جائے اور انہیں مسلمان ممالک پر تسلط جمانے پر آمادہ کیا جائے۔ اور اس تسلط کے لئے خود مسلمانوں کے اندر ایک احساس کہتری پیدا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاسی پروپاگنڈے سے مرعوب ہو کر اسلامی لٹریچر کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لینا کسی باغیرت مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب یہ نہیں کہ ہم اسلام کے خد و خال کی قطع و برید کرنا شروع کر دیں بلکہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مبنی برحق ہونے کی دلائل فراہم کی جائیں اور جارحانہ حملہ کر کے معترضین کا منہ بند کر دیا جائے

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی لٹریچر کوئی ایسی شئے ہے جو کسی ایک کتاب گھر میں جمع ہے کہ علمائے اسلام کا کوئی بورڈ بیٹھے اور جس طرح یورپ کے مسیحی علماء کنونشن منعقد کرتے تھے اور بائبل کا ترجمہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق اس میں مطالب شامل کر دیتے تھے۔ وہ بھی اسلامی لٹریچر میں حسب منشاء "اصلاح و ترجمہ" روا نما کر دے اس کے بعد وہ سارے باقی لٹریچر کو نذر آتش کر دے اور جب کوئی مستشرق کسی بات پر اعتراض کرے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ دکھاؤ کہاں وہ بات موجود ہے۔ مولانا غلام مرشد ایک وسیع المطالعہ عالم دین ہیں۔ وہ ذرا غور فرمائیں کہ اس قسم کا کوئی اقدام عملاً ممکن ہے؟ اور اگر ممکن نہیں اور چودہ سو برس میں جو لٹریچر تیار ہوا ہے۔ اس پر خط نسخ پھیرنا عملاً ناممکن ہے تو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ خود ہی ہتھیار ڈال کر اعتراف کر لیا جائے کہ مستشرقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات کرتے ہیں وہ ان مستشرقین کی بے ایمانی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ خود علمائے سلف ہی نے اس کا مواد فراہم کر کے ان کو مہیا کیا ہے۔

مولانا غلام مرشد ہی اندازہ لگائیں کہ وہ اسلام کے حق میں کتنی غلط اور کتنی خطرناک صورت حال پیدا کر رہے ہیں۔ اور اگر ان کی (معاف کیا جائے) اس "احمقانہ" تجویز پر عمل کرنے کے لئے فی الواقع کوئی مسلمان قوم تیار ہو جائے تو وہ کفار و مستشرقین کی خدمت کرے گی یا اسلام کی عزت قائم کرے گی۔ اس کے بعد تو مسلمانوں پر حجت قائم ہو جائے گی کہ مستشرقین کے اعتراضات درست اور بجا تھے۔ اسی لئے تو مسلمانوں نے اس "بارِ گناہ" کو چھپانے کی کوشش کی۔

اور ہمیں معاف کیا جائے اس قسم کا غمخوارانہ اور شرم آمیز رویہ اختیار کرنے میں مولانا غلام مرشد نہ تنہا ہیں اور نہ پہلے آدمی ہیں اصل میں یہ ایک چور ہے جس نے ابتداء سے ان اہل علم کے قلب و ضمیر میں نقب لگائی ہے جن کے اپنے ایمان و یقین کی دیواریں کمزور اور بوسیدہ تھیں حقیقت میں ان کا اپنا دل تشکیک کے مرض کا شکار ہو چکا تھا۔ غیر مسلم معترضین کا تو محض بہانہ تھا خود ان کا اطمینان اسلام کی تعلیمات کی صداقت کے بارے میں متزلزل ہو چکا تھا۔ لہٰذا جوں ہی کسی غیر مسلم معترض نے قرآن و سنت کے کسی پہلو پر اعتراض کیا، انہوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے لیکن چونکہ بہرحال وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اس لئے یا تو انہوں نے تاویل کر کے پیچھا چھڑایا یا پھر اس پہلو کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ قرآن و سنت کے بارے میں تحریف و تاویل اور انکار کے جتنے فتنے اٹھے ہیں اور جن کا قلع قمع کرنے کے لئے ائمہ ہدیٰ نے سر دھڑ کی بازی لگائی ہے وہ اسی بے یقینی کے مارے ہوئے "علماء" کے اٹھائے ہوئے تھے حضرت امام احمد بن حنبل

رضی اللہ عنہ کے زمانے کا فتنۂ خلقِ قرآن اسی ذہن کا کرشمہ تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کا "دینِ الٰہی" اسی کارخانے نے تیار کیا تھا۔ سرسید مرحوم کا علم کلام اسی مرعوب ذہنیت کی پیداوار تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی دعوت اسی کا شاخسانہ تھی اور آج انکارِ سنّت اور اسلام کی ترمیم اور حک و اصلاح کے جو غلغلے سننے میں آتے ہیں وہ اسی مرضِ "تشکیک" کے انڈے بچے ہیں۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا تھا کہ "آدم پیدا ز بے یقینی"۔

ہم پورے جزم و یقین اور اذعان کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں اور اس دعوے کے لئے ہمارے پاس ناقابلِ تردید دلائل ہیں کہ اسلامی لٹریچر میں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس پر کوئی مومن شرمائے۔ اور اسلامی لٹریچر سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لٹریچر ہے جو اہلِ علم کے نزدیک مستند ہے۔ واعظوں کی کہانیاں اور شاعروں کی خرافات نہیں۔ اور مولانا غلام مرشد تم سے بہتر جانتے ہیں کہ وہ مستند لٹریچر کیا ہے۔ علمائے اسلام ابتدا سے وہ کام کرتے آئے ہیں جس کی فی الحقیقت ضرورت ہے۔ اور اب اگر کسی مزید اقدام کی حاجت ہے تو یہ ہے کہ جاذبِ نظر اور مدلل طریق پر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے اور مسلمانوں کو عملاً اسلام کا پابند بنایا جائے۔ اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو خطرہ کفار و مستشرقین کے اعتراضات سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی اپنی بے عملی اور خلافِ اسلام عمل سے ہے۔ اگر کرنے کا کام ہے تو یہ ہے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خمِ طرۂ یارے گیرند

محترم مدیرِ ایشیا نے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ مستند اسلامی لٹریچر میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر کوئی مومن شرمائے۔ اس کے جواب میں ہم بآسانی یہ کر سکتے تھے کہ اپنے مستند ترین مذہبی لٹریچر سے ایسی مثالیں پیش کر دیتے جنہیں دیکھ کر ہر سلیم الطبع مسلمان کی نگاہیں زمین میں گڑ جائیں۔ لیکن اس سے بات کا رُخ کسی اور سمت کو مڑ جاتا اور اصل سوال (جو ہمارے نزدیک بے حد اہم ہے) الجھاؤ میں پڑ کر رہ جاتا۔ اس لئے ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے۔ نہ ہی ہم سردست اس تفصیل میں جانا چاہتے ہیں کہ اس گروہ کی طرف سے اس قسم کی مبارک تجویز کی مخالفت کے محرکات کیا ہیں اور اس سے خود ان کے اپنے لٹریچر اور "امارت" پر کس طرح زد پڑتی ہے۔ ہم اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جس زمانے میں ہمارا یہ "مستند اسلامی لٹریچر" مرتب ہونا شروع ہوا ہے، خود انہی حضرات کی تحقیق کے مطابق اُس وقت اسلامی معاشرہ کی حالت کیا ہو چکی تھی۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی "تجدید احیائے دین" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ہی "حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔ اس کے بعد جاہلیت نے مرضِ سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے ... یہ جاہلیت

بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی ..... جاہلیت خالصہ نے حکومت و دولت پر قبضہ جمایا (اور اس کے بعد) امراء، حکام، ولاۃ، اہل لشکر اور متمولین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیلا اور اس نے اخلاق و معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہوا اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب ہوئے ...... چنانچہ یہی وجہ تھی کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی۔

یہ تھی اس معاشرہ کی حالت جس میں وہ لٹریچر مرتب ہوا جسے اب "مستند اسلامی لٹریچر" کہا جاتا ہے۔ اس لٹریچر میں، اور تو اور، خود احادیث کی کیفیت یہ تھی کہ مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق "پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگ گیا تھا جو موضوع تھیں۔ اور بعد میں آنے والی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب ملی جلی تھیں۔"

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ بے شک جب یہ کتابیں مدون ہوئی ہیں تو ان میں غلط اور صحیح باتیں مخلوط تھیں لیکن بعد میں ارباب جرح و تعدیل نے، ان میں تحقیق کے بعد، غلط کو صحیح سے الگ کر کے رکھ دیا اور اب جو لٹریچر ہمارے پاس موجود ہے اس میں کسی قسم کی مزید چھان بین کی ضرورت نہیں لیکن دیکھئے کہ اس باب میں بھی مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب 'تفہیمات حصہ اول' میں ان تمام کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ائمہ سلف نے اس لٹریچر کی چھان بین کے سلسلہ میں کیں، لکھتے ہیں:۔

> ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہوں وہ درحقیقت منقطع ہو ...... یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح اور تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (صفحہ ۳۲۲)

جو تحریک اس وقت پیش کی جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارا اسلامی لٹریچر صرف اس حد تک قابلِ اعتماد ہے کہ اس سے سنت نبوی اور آثار صحابہؓ کی تحقیق میں مدد لی جائے۔ اس پر کلی اعتماد نہ کیا جائے۔ آپ غور فرمائیے کہ وہی بات مودودی صاحب کہیں تو مجدد اور محقق کہلائیں، اور وہی بات جب ان کے گروہ سے باہر کے لوگ کہیں تو جاہل، احمق، فتنہ پرداز، منکرِ حدیث، اور نہ معلوم کیا کیا قرار پائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس مخالفت کا پہلا جذبہ محرکہ یہ ہے کہ

یہ آواز ان کے گروہ سے باہر سے کیوں اٹھی ہے ؟

یہ تو رہی ہمارے مؤرّخین کے لٹریچر کی حیثیت۔ اس کے بعد آنے والوں نے ان بزرگوں کے ساتھ کیا کیا، اس کے متعلق بھی مودودی صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ تفہیمات حصہ دوم میں لکھتے ہیں (اور اس عبارت کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ یہ اس کتاب کے جیکٹ پر درج کی گئی ہے)

دُنیا میں انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ہمیشہ ایسے پاک نفوس پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی زبان اور اپنے عمل سے اس کو حق و صداقت کا سیدھا راستہ دکھایا ہے ——— لیکن ——— انسان اکثر ان کے اس احسان کا بدلہ ظلم ہی کی شکل میں دیتا رہا ہے۔ ان پر ظلم صرف ان کے مخالفوں ہی نے نہیں کیا کہ ان کے پیغام سے بے رخی برتی، ان کی صداقت سے انکار کیا، ان کی دعوت کو رد کر دیا اور ان کو تکلیفیں دے دے کر راہ حق سے پھیرنے کی کوشش کی ——— بلکہ ——— ان پر ظلم ان کے عقیدت مندوں نے بھی کیا کہ ان کے بعد ان کی تعلیمات کو مسخ کیا، ان کی ہدایتوں کو بدل ڈالا، ان کی کتابوں میں تحریف کی، اور خود ان کی شخصیتوں کو اپنی عجائب پسندی کا کھلونا بنا کر الوہیت اور خدائی کا رنگ دے دیا۔

پہلی قسم کا ظلم تو ان نفوس قدسیہ کی زندگی تک یا حد سے حد اس کے چند سال بعد تک ہی محدود رہا، مگر یہ دوسری قسم کا ظلم ان کے بعد صدیوں تک ہوتا رہا اور بہت سے بزرگوں کے ساتھ آج تک ہوئے جا رہا ہے۔ (تفہیمات جلد دوم)

یہ تحریک اسی لئے اٹھی ہے کہ جن مظلوم بزرگوں کے ساتھ اس قسم کا ظلم ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس وقت تک ہو رہا ہے انہیں اس ظلم و ستم سے بچایا جائے لیکن اس تحریک کے مؤلفین کے نزدیک ان بزرگوں کو اس ظلم و ستم سے بچانا، ان کے ساتھ سخت دشمنی کرنا ہے ! یا للعجب

ہم ملک کے ذمہ دار حضرات کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ جن لوگوں کے دل میں حضور رسالت مآبؐ کی عظمت و جلالت، صحابہ کبارؓ کی عزت و تکریم اور بزرگانِ سلف کی عقیدت و ارادت کا کچھ بھی احساس ہے، اس مبارک تحریک کو ان سب کی تائید حاصل ہے۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ جو فرد، جماعت، ادارہ یا حکومت اس کارِ خیر کو اپنے ہاتھ میں لے گی وہ اسلام کی عظیم ترین خدمت سر انجام دے گی اور یہ خدمت اس کے لئے سعادتِ کونین کا موجب ہوگی۔

"معاصر ایشیا" نے کہا ہے کہ ہمارے اسلامی لٹریچر میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو وجہ کچھ بھی نہیں کہ آنا کو انہیں اس قسم کی تحقیقاتی کوشش سے خوف کیوں پیدا ہو رہا ہے ——— آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک

—— اور اگر اس میں کوئی ایسی بات ہوئی تو اسے نکال دینے سے اس لٹریچر کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ ہو جائے گی ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اس قسم کے اقدام سے سمجھا یہ جائے گا کہ ہمیں اس لٹریچر کے متعلق کچھ شبہ ہے جسے رفع کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ تو گذارش یہ ہے کہ ہم اس لٹریچر پر ایمان لانے کے لئے کب مکلف ہیں جو اس میں اس قسم کا شبہ کرنے سے تھرتھراتیں؟ یہ تو صرف خدائی کتاب ہے جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف ہیں اور جس میں کسی قسم کا شک و شبہ ایک مسلمان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ حیثیت کسی انسانی تصنیف کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس باب میں ہم خود قدامت پرست طبقہ کے امام (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم) کا یہ قول نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے

> روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے یقینیات وغیرہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی نہیں ماننا پڑے گا کہ یہ بخاری کی روایت دربارہ کذب حضرت ابراہیمؑ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۴۹۹)

باعثِ ہزار فخر و مسرت ہوگا وہ یومِ سعید جب اس مبارک تحقیق و تمحیص کے کام کا آغاز ہوگا یہی وہ نشو و ارتقی ہے جس سے شجرِ اسلام پر دوبارہ بہار آ سکے گی۔ اور ملت کا صحنِ چمن، بارِ دیگر، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کرے گا۔ ولو کرہ المشرکون۔

پرچہ نہ ملنے کی شکایات

خریدارانِ طلوعِ اسلام کے لئے یہ وضاحت اشد ضروری سمجھی گئی ہے کہ طلوعِ اسلام کا ہر پرچہ پوری چیکنگ اور انتہائی احتیاط کے ساتھ پوسٹ کیا جاتا ہے۔ ہماری اس انتہائی کوشش کے باوجود پرچہ نہ پہنچنے کی شکایات بڑی سوہانِ روح ہیں طلوعِ اسلام کے لئے خریداروں کا شدتِ انتظار اور پھر پرچہ نہ ملنے پر ان کے جذبات کی کیفیت ہمیں اس تمام صورت کا گہرا احساس ہے لیکن ہماری انتہائی امکانی کوششوں کے باوجود جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے بس کا روگ نہیں رہا۔ ہم محکمہ ڈاک کو بھی اس صورتِ حال پر توجہ کر رہے ہیں اور خریداران سے بھی التجا کرتے ہیں کہ اپنی شکایات میں غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ہماری اس مجبوری کو پیشِ نظر رکھیں۔ ہم ہر شکایت موصول ہونے پر دوبارہ (بلا قیمت) پرچہ ارسال کر دیتے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ حوالہ ڈاک ہونے کے بعد ہر پرچہ جیسے دستبرد سے محفوظ رہے اور متعلقہ خریدار تک پہنچ جائے۔

ناظم ادارہ

قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کا نکھرا ہوا حل

جلد اوّل — جلد دوم — جلد سوم

مفسرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا خصوصی دلکش شگفتہ اور آسان فہم اندازِ نگارش

سلیم کے نام خطوط

یہ حقیقت کشا خطوط قلبِ سلیم میں اُبھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جواب پیش کرتے ہیں اور نوجوانانِ ملت کے قلب و نظر کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی حیات نواز تحریک ہیں۔

قیمت
جلد اوّل ——— آٹھ روپے
جلد دوم ——— چھ روپے
جلد سوم ——— چھ روپے

ملنے کا پتہ:-
مکتبہ طلوعِ اسلام
۲۰-بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

عصرِ حاضر کی بے مثال تصنیف

انسان نے کیا سوچا؟

از پرویز

پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین

فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ہی کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اندازِ تحریر ایسا سلجھا ہوا ہے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دینِ حق سے قرب پیدا ہوگا۔"

(روزنامہ "نوائے وقت" لاہور)

مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرینِ عالم کے خیالات کو ترتیب دے کر ایک واضح تصویر پیش کی ہے یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انھیں اس گمراہی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے اور فاضل مصنف کے تبحرِ علمی کا ثبوت

(ہفت روزہ "قندیل"، لاہور)

ٹائپ کی حسین طباعت — سفید کاغذ — جلد مضبوط — گرد پوش سے مزین

قیمت ——— بارہ روپے

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

ملنے کا پتہ:-

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷-بی ---- شاہ عالم مارکیٹ ---- لاہور

باسمہ تعالیٰ

پاکستان کی کہانی

(اقبال۔ جناح اور ایوب کی زبانی)

شائع کردہ

ادارہ مطلوع اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

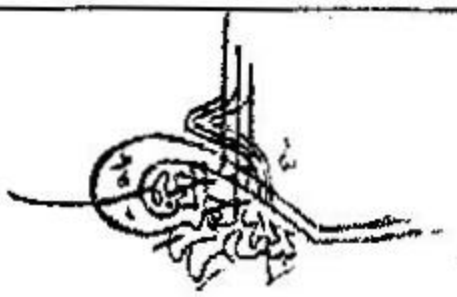

پاکستان کی کہانی

جب ہندوستان میں تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تو وہاں پوزیشن یہ تھی کہ ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی۔ ہندوؤں کی اسکیم یہ تھی کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے، ملک میں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ جمہوری انداز حکومت کے معنی یہ ہیں کہ جس جماعت کی اکثریت ہو، اسی کی حکومت ہو۔ لہٰذا ہندوستان میں جمہوری انداز حکومت، بالفاظِ دیگر ہندوؤں کی مستقل حکومت تھی اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا، ان کے لئے انگریز کی محکومی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کرنا تھا۔ خالص سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو "آزادی" کی یہ شکل مسلمانوں کے لئے کس طرح قابلِ قبول ہو سکتی تھی؛ لیکن مسلمانوں کے لئے اس مسئلہ کا تعلق عمومی سیاست سے ہی نہیں تھا، ان کے دین سے بھی تھا۔ ہندو (یا ہر غیر مسلم) کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ تھا (اور ہمیشہ یہی مفہوم ہوتا ہے) کہ ملک پر اہلِ ملک کی حکومت ہو تو اسے آزادی کہتے ہیں اور اگر غیر ملک والوں کی حکومت ہو تو وہ محکومی کہلاتی ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک، آزادی اور محکومی کا تصور اس سے الگ ہے۔ یہ اگر قرآنی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں، تو آزاد ہیں اور اگر ملک کا نظام غیر قرآنی ہے تو ان کی آزادی اور محکومی میں کوئی فرق نہیں۔ آزادی اور محکومی کے

آزادی اور محکومی کا اسلامی تصوّر

اس بنیادی فرق کے پیش نظر، اگر ہندوستان کا ہندو مسلمانوں کو برابر کے حقوق بھی دے دیتا، تو بھی مسلمان اپنے آپ کو آزاد نہیں کہلا (اور سمجھ) سکتا تھا، اس لئے کہ نظام تو وہاں بہرحال سیکولر (SECULAR) ہوتا۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ سیکولر نظام اسے کہتے ہیں جس میں مملکت کو بلا حدود و قیود قانون سازی کے اختیارات ہوتے ہیں، اور اسلامی نظام میں یہ اختیارات قرآن کے غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی اس میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIONTY) مملکت کو حاصل نہیں ہوتا، کتاب اللہ کو ہوتا ہے۔

ہندوؤں (بلکہ جملہ غیر مسلموں) اور مسلمانوں کے نقاطِ نگاہ کا یہ بنیادی فرق تھا جس سے وہاں قسم قسم کے الجھاؤ پیدا ہو رہے تھے اور غیر مسلم تو ایک طرف، بسا اوقات مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ہم میں ایک ہستی موجود تھی جسے مبدأ فیض کی طرف سے وہ قرآنی بصیرت عطا ہوئی تھی جو ہر مشکل مرحلہ پر ملتِ اسلامیہ کے لئے قندیلِ راہ بنتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا پیش کردہ حل

یہ ہستی تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی۔ انہوں نے کہا (اور اس بات کو وہ مدتوں پہلے سے کہتے چلے آ رہے تھے) کہ یہ تمام الجھنیں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ تم اس مفروضہ پر چلتے ہو کہ ہندوستان کی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اور ہندو (بلکہ تمام غیر مسلم)، اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہ مفروضہ سرے سے غلط ہے۔ مسلمان اشتراکِ ایمان (اسلامی آئیڈیالوجی) کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اس لئے یہاں مابہ النزاع مسئلہ ایک قوم کے مختلف افراد میں تقسیمِ حقوق کا نہیں۔ یہاں دو مختلف قوموں کے مستقبل اور ان کی آزادی اور محکومی کا سوال درپیش ہے۔ لہٰذا، جب تک اس سوال کو بین الاقوامی (INTER - NATIONAL) نقطۂ نگاہ سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کا کوئی حل نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا متعین حل، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) کے خطبۂ صدارت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد، جداگانہ مملکت قائم ہونی چاہئے۔ انہوں نے فرمایا کہ:-

> مسلم مملکت کے لئے میرا یہ مطالبہ، ہندوستان اور اسلام، دونوں کے لئے نفع بخش ہوگا ہندوستان کو اس سے، اس (حقیقی) امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہوگی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا جس سے یہ اس مقصد کو پا سکے گا جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے، اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین

تعلیم اور ثقافت کو (پھر سے) زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب آنے کے قابل بنا سکے۔

انہوں نے، اس سے بھی پہلے (اپنے خطباتِ تشکیلِ الہیاتِ) اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ:-

اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں متشکل کرنے کی آرزو کا مظاہرہ ہے۔ (ص ۱۴۶)

بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں کہ

اسلام تخت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ صرف خدا سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (ص ۱۴۰)

اس سے تحریکِ پاکستان کے تصور کا آغاز ہوا۔

قائدِ اعظم

اس کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے اس تحریک کو عملی شکل دی۔ وہ مسلسل اور متواتر ان دو بنیادی تصورات کو دہراتے رہے جو مطالبہ پاکستان کی اساس اور اسلامی مملکت کے لاینفک اجزائے ترکیبی تھے یعنی (۱) قومیت کا مدار آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے، نہ کہ ہم وطنی پر اور (۲) اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی کے حدود، قرآن کریم کے اصول و احکام متعین کرتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اس حقیقت کو واضح کیا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔ (مثلاً) انہوں نے ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو "یومِ اقبال" کی تقریب پر اپنے پیغام میں کہا۔

اسلامی مملکت

علامہ اقبال اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلاسفر تھے لیکن وہ عملی سیاست دان بھی کم پائے کے نہ تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمان کامل اور یقینِ محکم کی بنیاد پر، ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو (جو مسلمانوں کے تاریخی اماکن ہیں) ہندوستان سے الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے۔ (تقاریرِ جناح۔ جلد دوم صفحہ ۲۳۲)

انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

پاکستان کے تصور کو، جو مسلمانوں کے لئے اب ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی

سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مسلم مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گذشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔ (ایضاً صفحہ ۸)

پھر انہوں نے، ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ (پشاور) کی کانفرنس میں کہا:-

مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں، اپنے ضابطۂ حیات ثقافتی نشوونما روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۳)

۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو، انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں کہا:-

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم (غیر ملکی حکومت سے) آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے (حقیقی) مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ (نہایت) ضروری ہے۔ یہ بیش بہا تحفہ اور خزانہ ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ (اس سے ہم خود ہی فیض یاب نہیں ہونگے بلکہ ہمارے ساتھ) اور بھی اس سے متمتع ہوں گے۔ . . . . ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، بلکہ اس قابل بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۶)

قائدِ اعظمؒ باریک بین مقنن اور عملی سیاست دان تھے، اس لئے انہوں نے "اسلامی مملکت" کی اصطلاح کو مبہم نہیں رہنے دیا کہ (بعد میں) جس کے جو جی میں آئے اس سے مطلب اخذ کرلے، اور جس قسم کی مملکت جی چاہے قائم کرکے، اس پر اسلامی لیبل لگا دے۔ انہوں نے اسلامی مملکت کے حدود متعین کر دئے۔ اس باب میں ان کے بہت سے اقوال نقل کئے جا سکتے ہیں، لیکن، ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے، ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو، حیدر آباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوالات کے جواب میں جو کچھ کہا، اس کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ سلسلۂ "سوال و جواب" گہرے غور و فکر کا مستحق ہے۔

اسلامی مملکت کیا ہوتی ہے؟

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے، البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے

متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال :۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟

جواب :۔ اشتراکیت۔ بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک۔ دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال :۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے ؟

اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائداعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک نقطہ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے۔ جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا :۔

جواب : ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ :۔

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔

(۳) قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

(۴) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

قائداعظمؒ کے دل میں قرآن کریم کی کس قدر عظمت تھی اور وہ اسے کس طرح، زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل اور واحد ضابطۂ حیات سمجھتے تھے، اس کا اندازہ ان کے اس پیغام سے لگائیے جو انہوں نے (ستمبر ۱۹۴۸ء میں، بتقریب عید) قوم کو دیا۔ انہوں نے فرمایا:

قرآن کریم کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحر اطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسانی کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے جو مذہب[1] معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول، اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔ (تقاریر جناح۔ جلد دوم۔ ص ۴۰۵)

انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں فرمایا۔

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی ہے؟

وہ بندھن اور وہ رشتہ۔ وہ چٹان اور وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی ——— ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک اُمت۔

(۲)

---

[1] مذہب کے بارے میں قائداعظم کا مفہوم سابقہ انٹرویو میں سامنے آچکا ہے۔

اب اس اسلامی آئیڈیالوجی کے دوسرے حصے کو لیجئے۔ یعنی اس کے اس دوسرے عنصر کو کہ قومیت کی تشکیل اشتراکِ دین سے ہوتی ہے، نہ کہ وطن کے اشتراک سے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے، آج سے قریب پچاس سال پہلے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

بنایا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے نرالا
بِنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

مسلم ہندو دو قومیں

قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران، اس حقیقت کو اس شدو مد سے دُہرایا کہ اسے بہروں نے بھی سُنا اور اس کے نتائج کو اندھوں نے بھی دیکھا۔ درحقیقت، مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہی یہی تصور تھا۔ انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سپیشل سیشن (منعقدہ ۲ مارچ ۱۹۴۱ء) میں کہا :-

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانت دار آدمی بھی اس حقیقت سے اختلاف کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے یکسر الگ ایک (مستقل بالذات) قوم ہیں۔ (تقاریرِ جناح۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۶)

پھر انہوں نے ایڈورڈس کالج (پشاور) میں (۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو) کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵)

انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

ہندو اور مسلمان، خواہ وہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں، کبھی ایک قوم کے اجزا نہیں بن سکے۔ وہ ہمیشہ دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں ..... پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ (ایضاً)

اس اختلاف کو انہوں نے ہندوستان ہی میں نمایاں نہیں کیا، بلکہ سات سمندر پار، ولایت پہنچ کر بھی اس کا واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔ انہوں نے ۱۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم اپنے تصور کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات ایسے بنیادی ہیں کہ زندگی کا کوئی اہم معاملہ ایسا نہیں جس میں یہ دونوں متفق ہوں۔ (ایضاً ۵۰۳)

مطالبۂ پاکستان کا ریزولیوشن مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس، لاہور منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں پیش (اور پاس) ہوا تھا

اس اجلاس کی صدارتی تقریر میں قائداعظم نے فرمایا :-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں، ایک قوم کا غلط تصور حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور ہماری بہت سی مشکلات اسی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم نے بروقت اپنے رجحانات کی اصلاح نہ کی تو نتیجہ پورے ہندوستان کی تباہی ہوگا یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان مذہب کے معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں کا ادب جدا جدا ہے نہ تو یہ آپس میں شادیاں رچا سکتے ہیں اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھا سکتے ہیں، حقیقتاً وہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ ان کی تاریخیں مختلف۔ ان کا رزمیہ جدا جدا اور مشاہیر الگ الگ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ان کی فتح و شکست کی حیثیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر ڈالے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔ (قائداعظم محمد علی جناح)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد، اس موضوع پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قائداعظم کی ۱۴ اگست کی تقریر

قائداعظم نے حصولِ پاکستان کے بعد، پہلے ۱۱ اگست اور پھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دو تقاریر کی تھیں، جن کے بعض الفاظ کی آڑ لے کر، یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے (تشکیلِ پاکستان کے بعد) اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ ان تقاریر میں انہوں نے کہا تھا کہ

مملکت پاکستان میں تمہیں اس امر کی آزادی ہے کہ تم مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا اپنی دوسری پرستش گاہوں میں۔ تمہارا مذہب و مسلک کچھ ہی ہو، اس کا اس بنیادی حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ ہم سب ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں ..... پاکستان کا جھنڈا کسی ایک فرقہ کا نہیں۔ (یہ سب کا مشترکہ جھنڈا ہے) ..... وغیرہ وغیرہ۔

ان تقاریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قائداعظم نے پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے اور دین کی بنیادوں پر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم قرار دینے کے خیالات کو ترک کر دیا تھا اور وہ اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

ہمارے نزدیک، قائداعظمؒ کے متعلق یہ خیال کرنا، ان کے کیریکٹر پر ایک سنگین حملہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو باتیں وہ تحریکِ پاکستان کے دوران اپنے عقیدے کے طور پر کہا کرتے تھے، وہ سب منافقانہ سیاسی حربے تھے۔ جب پاکستان مل گیا تو انہوں نے اس "منافقت" کو خیرباد کہہ کر اصلی حقیقت کا اظہار کر دیا! جو شخص قائداعظمؒ کی زندگی سے ذرا بھی واقف ہے، وہ ان کے خلاف شاید اور کچھ تو کہہ سکے لیکن یہ کبھی نہیں کہہ سکے گا کہ وہ منافق تھے۔ لہٰذا ان کی محولہ بالا تقاریر سے ایسا نتیجہ اخذ کرنا، نہ صرف ان کی ذات پر شدید حملہ ہے بلکہ حقیقت کے بھی خلاف ہے۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان تقاریر کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے سطحی بین نگاہوں میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے ——— یا جن سے پاکستان دشمن عنصر ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن جن حضرات کے سامنے وہ حشر انگیز حوادث ہیں جو اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں رونما ہو رہے تھے، وہ اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت اس کا کسے ہوش تھا کہ وہ الفاظ کے انتخاب میں ایسی باریکیوں تک جاتا؟ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تقاریر، قائداعظمؒ کی آخری تقاریر نہیں تھیں۔ وہ اس کے بعد بھی قریب ایک سال تک زندہ رہے اور انہوں نے متعدد مقامات پر تقاریر بھی کیں اور دوسرے طریقوں سے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ کیا ان دوران میں ان کے کسی ایک لفظ سے بھی یہ مترشح ہوا کہ وہ اسلامی مملکت اور دو قومیتوں کے نظریہ کے متعلق اپنے عقیدہ سے رجوع کر چکے تھے؟

ان تقاریر کا صحیح مفہوم کیا ہونا چاہیے، اس کے متعلق ہم ایک غیر مسلم کا بیان پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مسٹر جوشوا فضل الدین (JOSHUA FAZL-UD-DIN) مغربی پاکستان کی بیسائی جماعت کے لیڈر ہیں۔ وہ اپنے (انگریزی) پمفلٹ (RATIONALE OF PAKISTAN'S CONSTITUTION) میں لکھتے ہیں:

> لہٰذا یہ کہنا کہ قائداعظم نے، جو تخلیقِ پاکستان کے ذمہ دار تھے، حصولِ پاکستان کے بعد، اپنی پہلی تقریر میں کوئی ایسی بات کہی ہوگی جو پاکستان کے بنیادی مقصد کو باطل قرار دے دے، پاگل پن ہے۔ قائداعظم نے اپنی ان ہر دو تقاریر میں جو کچھ کہا تھا وہ صرف اتنا تھا کہ پاکستان کے باشندوں کے حقوقِ شہریت، بلا لحاظ مذہب و ملت، یکساں ہوں گے۔ یہی چیز آئینِ پاکستان کا بنیادی اصول ہونا چاہیے۔ اُس پاکستان کا جس کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی مملکت قائم ہو جائے، اور جسے ہمیشہ اصولاً اسلامی مملکت ہی رہنا چاہیے۔ ..... پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق و تحفظات کا فیصلہ لامحالہ اسلامی قانون

کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قانون کی تعبیر معقول انداز سے کرنی چاہیئے، نہ کہ متعصبانہ تنگ نظری سے جس کی توقع موجودہ لیڈرشپ سے نہیں کی جا سکتی۔

غیر مسلم اقلیتوں کے متعلق خود قائداعظم نے (مارچ ۱۹۴۱ء میں) یہ کہہ دیا تھا کہ :-

میری تجویز یہ ہے کہ اسلامی خطہ میں ہندو اقلیت کو، بہ حیثیت اقلیت، تحفظات دیئے جائیں گے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۶)

لیاقت علی خان مرحوم

جب، قائداعظم کی وفات کے بعد، نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے، ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو، اسمبلی میں "قرار دادِ مقاصد" پیش کی تو انہوں نے اپنی تقریر میں، جہاں پاکستان کے بنیادی تصورات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہاں اس کی بھی وضاحت کر دی کہ ان خیالات کو قائداعظم کی بھی تائید حاصل رہی ہے۔ انہوں نے کہا

جناب والا! میں اس موقع کو ملک کی زندگی میں بہت اہم سمجھتا ہوں، اتنا اہم کہ میں اسے حصولِ آزادی کے بعد، سب سے اونچا درجہ دیتا ہوں۔ اس لئے کہ حصولِ آزادی سے ہمیں اس کا موقعہ ملا کہ ہم ایک مملکت کی تعمیر اور اس کے نظامِ سیاست کی تشکیل، اپنے نصب العین کے مطابق کر سکیں۔ میں اس ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بابائے ملت، قائداعظم نے اس مسئلہ کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار متعدد بار فرمایا تھا اور ملت نے ان کے خیالات کی تائید بغیر مبہم الفاظ میں کی تھی۔ پاکستان اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ اس برصغیر کے مسلمان اپنی زندگی کی تعمیر اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق کرنا چاہتے تھے، تاکہ وہ دنیا پر عملاً واضح کر دیں کہ آج انسانی زندگی میں جو گوناگوں بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، اسلام ان سب کے لئے اکسیرِ اعظم کا حکم رکھتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا :-

ہم اہلِ پاکستان میں اتنی جرأت ہے کہ ہم اپنے اس ایمان محکم کا اعلان کر دیں کہ مملکت کے تمام اختیارات و اقتدارات، اسلام کے مقرر کردہ معیاروں کے مطابق استعمال کئے جائیں ..... لیکن میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ہم یہاں تھیاکریسی انداز کی حکومت قائم کریں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت کا حق مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہے۔ یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے۔

پاکستان کی مجوزہ اسلامی مملکت کے متعلق انہوں نے کہا :-

آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے دیگر راہ نماؤں نے ہمیشہ یہ غیر مبہم اور واضح اعلانات کئے کہ پاکستان کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کا اپنا مخصوص طریق زندگی اور ضابطۂ عمل ہے۔ انہوں نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق کا نام نہیں جیسے امورِ مملکت میں کسی قسم کا دخل نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، تمدنی امور کے لئے متعین ہدایات دیتا ہے اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں، معاشرہ کے طرزِ عمل کی راہ نمائی کرے۔ اسلام، ذاتی عقائد اور اخلاق کا نام نہیں۔

اقلیتوں کے حقوق کے متعلق انہوں نے کہا

ہم نے اپنے اس شوق و آرزو میں کہ ہم ایک اسلامی معاشرہ کی تعمیر کریں، غیر مسلموں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا۔ اگر ہم ایسا کرتے تو ہمارا یہ طرزِ عمل غیر اسلامی ہوتا۔ اگر ہم غیر مسلموں کی (مذہبی) آزادی کو سلب کرتے تو اس سے ہم اپنے دین کی حدود شکنی کے مجرم قرار پاتے۔

ان غیر مبہم اعلانات کے ساتھ مملکتِ پاکستان کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

(۰)

معاشی نظام

کسی مملکت کے سیاسی نظام کے اصولوں کے تعین کے بعد، سب سے پہلا سوال معاشی نظام کا ہوتا ہے۔ یوں تو نظامِ معیشت کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس نے ایسی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ باقی تمام مسائلِ حیات اس کے زیرِ سایہ چلتے ہیں۔ سیاسی نظام کی طرح، قرآن اپنا مخصوص معاشی نظام رکھتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا، تو قرآن کا معاشی نظام خصوصیت سے ان کے پیشِ نظر تھا۔ اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید فشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ

کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا تمام ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ شروع میں تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، جولائی ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس میں اسلام کے عدل عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کو پاکستان کے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیا (واضح رہے کہ یہ تقریر اگست ۱۹۴۷ء کی تقاریر کے قریب ایک سال بعد کی، اور غالباً قائداعظم کی زندگی کی آخری تقریر ہے)۔ اس میں انہوں نے فرمایا۔

ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے۔ اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا اور نوعِ انسان کی بہبود مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

اسی حقیقت کو نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے اپنی مذکورہ صدر تقریر میں دہرایا جب کہا کہ:

ہمارا ارادہ یہ بھی ہے کہ ہم پاکستان کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کی بنیادوں پر استوار کریں جس کا مقصد دولت کی بہتر تقسیم اور محتاجی کا دور کرنا ہے۔

ان حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ، مملکتِ پاکستان کا آغاز ہوا۔

آئین سازی کا مرحلہ

تشکیلِ مملکت کے بعد سب سے پہلا کام مملکت کے لئے آئین کی تدوین تھا۔ اس لئے کہ آئین ہی وہ ٹھوس اور بنیادی پیکیہ ہوتا ہے جو ان مقاصد کا مظہر بنتا ہے جس کے لئے مملکت وجود میں آتی ہے جن مقاصد کی برومندی کے لئے مملکتِ پاکستان وجود میں آئی تھی وہ (جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں) اس قدر واضح اور غیر مبہم تھے کہ ان کی روشنی میں آئینِ مملکت

کی تدوین کا کام کچھ بھی مشکل نہ تھا لیکن، گوناں گوں اسباب و علل کی بناء پر اسے ایسا مشکل اور پیچیدہ بنا دیا گیا کہ آٹھ نو سال تک یہ مسئلہ، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر گردش کرتا رہا۔ اس کے بنیادی ذمہ دار دو بڑے بڑے عنصر تھے —— ایک مفاد پرست سیاسی لیڈروں کا گروہ اور دوسرا وہ اقتدار پرست طبقہ جو مذہبی نقاب اوڑھ کر، حکومت کی مسندوں کو اپنے لئے مختص کر لینا چاہتا تھا۔ یہ دوسرا گروہ، پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا، اس لئے کہ یہ اپنی ہوس اقتدار کو "خدا اور رسول" کے نام کی اوٹ میں آگے بڑھاتا اور شریعت کے نام کی آڑ میں عوام کے جذبات سے کھیلتا تھا۔ اس نے، سب سے پہلے "بے حد و نہایت سرمایہ داری اور لامحدود زمینداری" کو عین اسلام قرار دے کر، سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ کی حمایت حاصل کی، اور ان کے بل بوتے پر اپنے پراپیگنڈا کی مشینری کو اتنا وسیع اور مستحکم کر لیا کہ ان کے سامنے

مذہب کی آڑ میں سیاست

کسی دوسرے کی آواز ابھر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ حضرات، تحریک پاکستان کے دوران مطالبہ پاکستان کے سب سے بڑے مخالف تھے اور ان کی یہ مخالفت، آٹھ دس سال تک مسلسل اور پیہم جاری رہی لیکن پاکستان بننے کے بعد، یہ اپنے آپ کو حکومت کی کرسیوں کا واحد حقدار قرار دیتے تھے۔ ان کے اس استحقاق کا "صغریٰ کبریٰ" یہ تھا کہ (۱) پاکستان ایک اسلامی مملکت بننے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ (۲) اسلامی مملکت میں، شریعت کا قانون نافذ ہوگا، اور (۳) یہ ہم ہی بتا سکتے ہیں کہ قانون شریعت کسے کہتے ہیں۔ لہٰذا، کاروبار حکومت ہماری تحویل میں رہنا چاہئے۔ ان کے پروپیگنڈہ کا اثر یہاں تک پہنچا کہ (اس زمانے کی) مجلس آئین ساز کی متعین کردہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے یہ تجویز پیش کر دی کہ ایک علماء بورڈ مقرر کیا جائے جو ہر قانون کے متعلق فیصلہ کیا کرے کہ وہ

علماء بورڈ کی تجویز

شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور ان کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے۔ اس تجویز کی رو سے مملکت کا اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGN POWER) اس "مذہبی پیشوائیت" کے ہاتھوں میں چلا جاتا تھا، جو سنہ ۱۹۴۳ء سے اس کے حصول کے لئے کوشاں تھی جیسا اس نے اپنے عزائم کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ:-

> یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۃ خلائق کے سامنے اپنا پروگرام پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔ (ترجمان القرآن، دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء)

یہ تو خیر گذری کہ وہ اسمبلی ہی کالعدم قرار پا گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی تجاویز اور سفارشات بھی غت ربود ہو گئیں، ورنہ اگر (پناہ بخدا) اس کا تجویز کردہ آئین نافذ ہو جاتا تو کوئی شریف آدمی یہاں آزادی کا سانس،

نہ لے سکتا۔ اس لئے کہ انہوں نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ ہماری قائم کردہ حکومت "فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھے گی"۔ (اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ صرف ان اقتدار پرستوں کا پیدا کردہ الجھاؤ تھا جس کی وجہ سے آئین سازی کے متعلق عجیب عجیب قسم کی پیچیدگیاں سامنے آتی تھیں ورنہ یہ بات اس قدر آسان اور صاف تھی کہ اس

اسلامی آئین کا بنیادی اصول

میں کسی الجھن اور پیچیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسلامی آئین کی بنیادی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے (جنہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا) اپنے مخصوص انداز میں وضاحت کر دی تھی۔ انہوں نے (اپنے خطبات تشکیلِ الہیات میں) ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا کہ

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق سے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ۔ ۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (خطبات صـ ۱۴۷)

اس کا مطلب صاف ہے۔ اسلام زندگی کے کچھ اصول دیتا ہے جن کی حیثیت جہانگیر ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر نئی نسل آزاد ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاملات کا حل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود تلاش کرے۔ اس طرح، ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج سے کاروانِ انسانیت اپنی ارتقائی منزل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآن کریم کے اندر محفوظ کر کے دے دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا، قرآن ہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی آئین کی اصل و بنیاد قرار پاتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے لایا جاتا تھا کہ احادیث کی کیا پوزیشن ہے۔ علامہ اقبالؒ

نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، وضاحت سے بتایا کہ احادیث زیادہ سے زیادہ ان فیصلوں کا سراغ دیتی ہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے (جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی تھی) اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قرآنی اصولوں کی روشنی میں، نافذ فرمائے۔ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل نہیں ہیں چنانچہ (انہوں نے کہا کہ) اس باب میں امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا بھی یہی مسلک ہے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں آپ کے سامنے علامہ اقبالؒ کے اپنے الفاظ پیش کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ اقتباس طویل ہے لیکن اس کے بغیر اس اہم نکتہ کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں :-

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ نے علی حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علی حالہ رہنے دیا خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبر انہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے۔ اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے حالات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین

میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں۔ تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطباتِ اقبال صفحہ ۱۶۴-۱۶۳)

اس اقتباس میں، علامہ اقبالؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے مسلک کا حوالہ دیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے سب سے بڑے شارح، مولانا عبید اللہ سندھی (مرحوم) تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں :-

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہؐ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہؓ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کئے۔ خلافتِ عثمانیؓ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں۔ اور یہی ہماری رائے ہے۔ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائی لاز کہا جاتا ہے ..... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائی لاز اس وقت اور تھے اس وقت اور ہوں گے۔ جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق قدرتی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اسی کا نام فقہ ہے۔ (الفرقان ۔ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۹۴)

جہاں تک امام ابوحنیفہؒ کا تعلق ہے خطیب بغدادی نے اپنی مشہور تاریخ میں متعدد اسناد سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ (امام اعظمؒ) احادیث کے متعلق وہی عقیدہ رکھتے تھے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ :-

ابوعاصم نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ مجھ سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا انہوں نے محمد بن جہاں سے۔ انہوں نے رافع بن عمیرؓ سے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچو ورنہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا۔ اس پر ابوحنیفہؒ نے بلا تامل کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

(خطیب بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۳۹۰)

اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے :-

ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبیؐ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانے میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال انتخاب فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے (ایضاً)

فقہ کی حیثیت

جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :-

جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ کے ناقدین نے ان فیصلوں کو ابدی قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔ (خطبات صفحہ ۱۶۹)

قرآن، حدیث اور فقہ (تینوں) کے صحیح صحیح مقام کے متعلق بحث کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :-

یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے، بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے، وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ——— حسبنا کتاب اللہ۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۴)

یہی وہ حقیقت تھی جسے (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) قائداعظمؒ نے ۱۹۴۱ء میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت و وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

اگر اس اصل الاصول کو، آئین سازی کا مرکز قرار دے لیا جاتا، تو اسلامی آئین کی تدوین میں کوئی مشکل ہی پیش نہ آتی۔ اس لئے کہ جہاں تک دین کے اصولوں کا تعلق ہے، خود قدامت پرست طبقہ کو بھی اس کا اعتراف

قدامت پرست طبقہ کا اعتراف

ہے کہ وہ سب کے سب قرآن کریم کے اندر ہیں، اور تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر واجب التسلیم چنانچہ اس باب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں :-

دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ (تفہیمات - جلد اول - صفحہ ۳۳۹)

وہ اپنی کتاب رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں :

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارتاً و کنایتہً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ (صفحہ ۶۲)

وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (صفحہ ۵۹۸) میں لکھتے ہیں :

حرام اور حلال . . . . حائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا۔ اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا، یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اسی حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوم (صفحہ ۳۸۹) میں لکھتے ہیں۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام

ما حرم اللہ فی کتابہ ۔ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو وہ معاف ہیں

پھر، قرآن کریم کا انداز بیان ایسا صاف، سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں

قرآن اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا اس کے لئے ضروری تھا، واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ (ترجمان القرآن۔ بابت اپریل، مئی ۱۹۵۵ء)

لیکن افسوس کہ، قرآن کریم کے متعلق کچھ کہنے کے باوجود، اسے آئین کی بنیاد نہ بنایا گیا (اور اس کی وجہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں) اور یہ خواب، کثرت تعبیر سے، پریشاں سے پریشاں تر ہوتا چلا گیا۔ بالآخر نو سال کا طویل اور قیمتی وقت ضائع کرنے کے بعد (۱۹۵۶ء کا) وہ آئین وجود میں آیا، جسے اسلامی کہنا تو درکنار، عام اصطلاح میں قابل عمل سیاسی آئین بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ اس میں مذہبی پیشوائیت کے لئے اقتدار یابی کی کافی گنجائش رکھی گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے "اسلامی آئین" قرار دے کر، جشن مسرت منایا تھا۔ قوم کا سنجیدہ طبقہ اس سے جس قدر افسردہ خاطر تھا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب انہیں، پاکستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

عسکری انقلاب

لیکن کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ فطرت کو مملکت پاکستان کی بقاء اور یہاں کے رہنے والوں کی بہبود خاص طور پر منظور ہے۔ چنانچہ، جس طرح پہلی مجلس آئین ساز کے (غیر متوقع طور پر) ٹوٹنے سے، یہاں حیات نو کا امکان پیدا ہو گیا تھا، ۱۹۵۶ء کے آئین کی زنجیروں سے رستگاری کے لئے بھی ——— دست از غیب برون آید و کارے بکند ——— کی شکل پیدا ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں یہاں عسکری انقلاب آیا، جس نے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، سابقہ آئین، اور اس کی بساط پر مشغول مہرہ بازی ارباب اقتدار (اور ان کی ہمنوا مذہبی پیشوائیت) کا تختہ الٹ دیا۔ اس تخریب (لا) کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے (۲۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کو لاہور میں) اعلان کیا کہ

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغ دار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیل پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کر دیا جائے کہ انہیں

ان کی کھوئی ہوئی چمک دمک اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔

(طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۵۹ء)

یعنی انہوں نے اعلان یہ کیا کہ اس انقلاب کا مقصد یہ ہے کہ مملکتِ پاکستان کو اس آئیڈیالوجی کا محسوس پیکر بنایا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا اور جس کی تصریح اقبالؒ اور جناحؒ نے اس شدومد سے کی تھی۔ بالفاظِ دیگر اس انقلاب سے قوم پھر اس مقام پر آگئی جہاں وہ ۱۹۴۷ء میں کھڑی تھی۔ اسے پھر سے ایک "صاف لوح" مل گئی جس پر یہ اپنی تقدیر از سرِ نو اپنے ہاتھ سے لکھنے کے قابل ہو گئی۔ صدرِ پاکستان، اس وقت سے آج تک، اپنے ان عزائم کو بار بار دہرائے چلے جا رہے ہیں اور ہر مقام پر اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ ہمارے پیشِ نظر اسی اسلامی آئیڈیالوجی کا احیاء ہے جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

اسلامی آئیڈیالوجی کا احیاء

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اُس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رُو سے پاکستان بہ حیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام بیشتر فیشن کے خلاف اور قدامت پرستی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔

پھر انہوں نے (جولائی ۱۹۵۹ء میں) مری میں کمشنروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تعبیر عصرِ حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کو روحِ اسلام سے کشید کیا جائے اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔

قرآن کا معاشی نظام

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

ٹنڈوالہ یار میں علماء کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:-

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ان کی باہم کش مکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پہ مسلط کر دے۔ مغرب کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے متصور ہوتی ہیں نظامِ کائنات

کمیونزم کا جواب

میں ان کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوعِ انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کش مکش میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی بن سکتا ہے جو روحِ انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔

اس خطرہ کی روک تھام کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا:-

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصرِ حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی۔ سیاسی۔ معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

آئینِ پاکستان کے سلسلے میں انہوں نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو پاک جمہوریہ کے دورہ کے سلسلہ میں ایک مقام پر کہا جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

اصول اور جزئیات

آپ ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ "اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے، حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔" یہ ہے اسلامی آئین کی وہ اصل بنیاد جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۸ء میں پیش کیا تھا۔ صدرِ پاکستان نے اس حقیقت کو عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر (۲۶ر اکتوبر کی شام کو) اپنی نشری تقریر میں علامہ اقبالؒ کے حوالہ سے ان الفاظ میں دہرایا:-

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصرِ حاضر میں روحِ اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے، کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے، لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے

پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں، وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں پہلا وقت آیا ہے کہ فوکرد مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

اسی سلسلہ میں انھوں نے آگے چل کر ایک پر علامہ اقبال کے یہ الفاظ پیش کئے:-

قرآن کریم کی اہم تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہ نمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ اس سلسلہ میں کرنے کا کام کیا ہے؟ اس ضمن میں انہوں نے دو ایسی بنیادی حقیقتوں کی نشاندہی کی جو فی الواقعہ ہماری اولین توجہات کی مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھا سکنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دور غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے (جس میں دین بھی شامل ہے) فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ نام نہاد تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم

پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)

غور کیجئے! انہوں نے کس طرح اس گہری حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ جہاں تک دین کے صحیح علم کا تعلق ہے، اس سے ہمارے نام نہاد "علمائے کرام" بھی اسی طرح کورے ہیں جس طرح مغربی تعلیم یافتہ طبقہ۔ جہالت کے پلیٹ فارم پر یہ دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

دین سے جہالت

صدر محترم کے نزدیک یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ انہوں نے مشرقی و مغربی کے اپنے حالیہ دورہ میں مختلف مقامات پر اس کا اعادہ کیا۔ انہوں نے ۷ نومبر کو قاہرہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے لئے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ بیتی کیا ہے؟ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالم اسلام پر نگاہ ڈالئے، بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پسماندہ اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورت حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہو گئی؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہ نماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملی روایات کے حفظ و بقا کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہ نمائی کر سکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضرور ہے اور (۲) ہم پر یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانین فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، تو ہم پھر دوسروں کے غلام

بن جائیں گے ۔۔۔۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی ۔ (ڈان - ۱۰ ر نومبر ۱۹۶۰ء)

۹ ر نومبر کو انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

جرأت تحقیق

جس بناء پر دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا۔ دین کی اصل و حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی۔ اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر ذہنی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا عمل دخل اس سے صدیوں پیچھے رہ گیا۔ اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطۂ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا ہو کے رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں ہمیشہ پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے، اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹیفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسے آگے بڑھاتے جائیں ۔ (ڈان ۔ ۱۰ ر نومبر ۱۹۶۰ء)

اس سے پہلے انھوں نے جدہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :-

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں، اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظامِ تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں، دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

اسلامی آئیڈیالوجی کے متعلق انہوں نے جدہ میں کہا :-

ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور روحانی اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجبِ تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان کے ذاتی

کے لئے دیا گیا تھا، انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے (قاہرہ یونیورسٹی کی تقریر میں) یہ اعلان کیا کہ:-

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامی آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجہ جواز یہی ہے، اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدق دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم حتی الامکان، عصر حاضر کی سائنٹیفک تحقیقات کے ضمن میں، اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔ (ڈان، ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

اور آخر میں انہوں نے دین کی پھر اسی اصل و حقیقت کو دہرایا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے جدہ کی تقریر میں فرمایا:-

آئین پاکستان

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان، اس بنیادی مسئلے کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان (FAITH) سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نفاذ پذیر کر سکیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں، شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔ (ڈان، ۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

یہ ہے وہ مقام جہاں کاروان پاکستان اس وقت کھڑا ہے۔ اس وقت آئینی کمیشن آئندہ آئین کی تدوین کے سلسلہ میں مصروف کار ہے۔ امید ہے وہ دو ایک ماہ میں اپنی سفارشات پیش کر دے گا۔ اس کے بعد، آئین کابینہ کی منظوری سے نافذ ہوگا۔ اس سلسلہ میں صدر محترم نے سال گذشتہ اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ

اگر کمیشن کی سفارشات (اسلامی آئیڈیالوجی کے) معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انہیں کبھی منظور نہیں کرے گی۔ اور اگر بفرض محال کابینہ نے انہیں منظور بھی کر لیا اور پارلیمان نے دیکھا کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں تو وہ دو تہائی اکثریت سے ان میں رد و بدل

کر سکے گی۔

(پاکستان ٹائمز: ۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء)

دُنیا بڑی بے تابی سے اس دن کا انتظار کر رہی ہے جب یہاں اسلامی اصول کے مطابق آئین نافذ ہوگا۔ کیوں کہ اس آئین کے ساتھ ہماری ہی نہیں بلکہ ساری دُنیا کی تقدیر وابستہ ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اصول اس کے سوا اور کیا ہے کہ "مملکت پاکستان اپنے تمام اختیارات قرآن کریم کے غیر متبدل اصول، قوانین اور احکام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گی۔"

اس مقام پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی اس گذارش کو ایک بار پھر دھرا دیں جسے ہم نے چھ ماہ قبل ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:۔

ہم جناب محترم المقام صدر المملکت پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں بصد ادب و احترام گذارش کریں گے کہ فطرت نے آپ کو ایک ایسے بلند مقصد کے لئے منتخب کیا ہے جس کی نظیر ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی...... یہ مقصد جس کے لئے اقتدار آپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے مملکت میں صحیح اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہو گیا تو یقین جانیں آپ کا نام جبینِ عالم پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخ انسانیت آپ کو زندہ اقوام میں بلند ترین مقام عطا کرے گی اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گی ۔۔۔۔ سابقہ ارباب حل و عقد نے فطرت کی اس عظیم و جلیل پیش کش کی قدر نہ کی ۔۔۔ خدا کرے آپ ان میں منفرد ثابت ہوں اور جو مسند بلند اب تک خالی پڑی ہے اس پر فائز المرام ہونے کا شرف حاصل کر سکیں۔ اور جب آپ حضور داور پروردگار جائیں تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے تبریک و تہنیت کے پھول برسائے کہ

یہ ہے وہ مرد بلند ہمت جس کی قوت بازو
سے زمانہ میں میرا سکہ رواں ہوا!!

فالحمد للّٰہ رب العالمین۔

لغات القرآن

جلد اوّل ـــــ جلد دوم

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا شاہکار

جس کا برسوں سے انتظار تھا

قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

قرآن کے الفاظ ـــــ قرآن کے تصوّرات ـــــ قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصہ اوّل میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔

ٹائپ کی حسین و دلکش طباعت ـــــ بہتر سفید کاغذ ـــــ پائیدار سنہری دیدہ زیب جلد

قیمت:- جلد اوّل ـــــ پندرہ روپے

جلد دوم (رائج تاش) پندرہ روپے

ـــــ (علاوہ محصول ڈاک) ـــــ

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

قائداعظمؒ ــــ بحیثیت گورنر جنرل پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد قائداعظمؒ، ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے "بے تاج بادشاہ" نہیں تھے۔ وہ اب مملکتِ پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ وہ اپنی اس جدید پوزیشن میں بھی، بار بار انہی خیالات کو دہراتے رہتے تھے جو وہ گذشتہ دس سال سے مسلسل و متواتر پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم ان میں سے صرف چند ایک مقامات پر ارشاد فرمودہ الفاظ کو درج ذیل کرتے ہیں

انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال، کراچی میں، حکومت پاکستان کے اعلیٰ افسروں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور سانس لے سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

پھر انہوں نے اسی ماہ کی تیس تاریخ کو، یونیورسٹی سٹیڈیم، لاہور میں ایک جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> ہم (ہندوؤں کی طرف سے) ایک ایسی سازش کا شکار ہوئے ہیں جو بڑی گہری اور سوچ سمجھ کر اختیار کی گئی تھی۔ اور جسے دیانت، شجاعت اور عزت کے ابتدائی اصولوں تک کو بالائے طاق رکھ کر بروئے کار لایا گیا ہے ہم حضور رب العزت سجدہ ریز ہیں کہ اس نے ہمیں ایسی ہمت اور یقین محکم عطا فرمایا جس

سے ہم نے شرک کی ان تمام قوتوں کا پورا پورا مقابلہ کیا۔ اگر ہم نے قرآن کریم سے راہ نمائی حاصل کی تو میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آخر الامر کامیابی ہماری ہی ہوگی۔

میرا آپ سب سے، اور ان تمام افراد سے جن تک میرا یہ پیغام پہنچے مطالبہ یہ ہے کہ آپ پاکستان کو اسلام کا مستحکم قلعہ بنائیے، اور اپنے آپ کو ایک ایسی عظیم ملت کی شکل میں تعمیر کرنے کے لئے جس کا مقصد ملک کے اندر اور باہر امن قائم کرنا ہو ——— عند الضرورت سب کچھ قربان کر دینے کا عہد کریں۔

۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے سبی دربار میں، اہل بلوچستان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اس اسکیم کو پیش کرتے ہوئے جو اصول میرے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں تھا وہ مسلم ڈیماکریسی کا اصول تھا۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس ذات اقدس و اعظم حضور رسالت مآبؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں مضمر ہے جس نے ہمیں قانون (خداوندی) عطا فرمایا۔ آیئے۔ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد سچے اسلامی اصولوں پر رکھیں ہمارے خدا نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہمارے مملکت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔

۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے آسٹریلیا کے باشندوں کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے فرمایا:۔

ہماری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہیں ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق تکریم اور عزت نفس کے اعتبار سے سب مساوی ہیں۔ اس لئے ہمارے اندر باہمی وحدت کا ایک خاص احساس ہے لیکن آپ کو اس باب میں کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے کہ پاکستان میں کسی قسم کی تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کی حکومت) کارفرما نہیں۔

پھر اسی مہینے میں انھوں نے اہل امریکہ کے نام ایک براڈکاسٹ میں، پاکستان کے مجوزہ آئین کے بارے میں ایک پیغام نشر کیا جس میں انھوں نے فرمایا:۔

پاکستان کی مجلس آئین ساز نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا علمبردار جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدت انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ ہم ان شاندار روایات کے وارث ہیں اور آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ کچھ بھی ہو، پاکستان میں تھیاکریسی کسی صورت میں بھی رائج نہیں ہوگی

جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں

انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں ایک عظیم جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ سب اس باب میں مجھ سے متفق ہوں گے، ہم خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں : آخرالامر مسلمان ہیں ۔ لہذا اگر تم ایک ملت بننا چاہتے ہو تو خدا کے لیے صوبجاتی تفریق کو خیرباد کہیئے ۔ صوبجاتی تفریق اور مذہبی فرقہ بندیاں ——— شیعہ سنی وغیرہ —— لعنتیں ہیں

انھوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چاٹگانگ میں عام استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

آپ درحقیقت میرے اور میری طرح لاکھوں مسلمانوں کے دل کی ترجمانی کریں گے جب آپ کہیں گے کہ پاکستان کی بنیاد عدل عمرانی اور اسلامی سوشلزم پر رکھنی چاہیئے جو اخوت انسانی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے تم ایسا کہنے میں بھی میرے خیالات کی ترجمانی کرو گے کہ یہاں ہر فرد کو (نشوونما کے) یکساں مواقع میسر ہونے چاہئیں ۔

۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو انہوں نے پشاور میں قبائلی جرگہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

آپ نے میرا جس گرمجوشی سے استقبال کیا ہے اور جن الفاظ میں میری خدمات کا تذکرہ کیا ہے، میں اس کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں میں نے جو کچھ بھی کیا ہے : اسلام کا خادم ہونے کی حیثیت سے کیا ہے

.... ہم مسلمان ایک خدا ، ایک کتاب قرآن مجید اور ایک رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں ۔ اس لئے ہمیں ایک امت کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہیئے ....

اب اس ملک میں غیروں کی حکومت نہیں ۔ اب یہاں مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کا راج ہے ۔

انھوں نے ۱۸ اپریل کو، ایڈورڈز کالج، پشاور کے پرنسپل، اساتذہ اور طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

ذرا سوچیے کہ کوئی شخص اس سے بڑھ کر اور کس چیز کی توقع کر سکتا ہے کہ یہ عظیم خطہ زمین اس اقتدار کے تابع آگئی ہے جسے اسلامی اقتدار کہا جاتا ہے ۔

اور ان کی آخری تقریر وہ تھی جو انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی میں فرمائی ۔ اس میں انھوں نے کہا :-

ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں ۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا ۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو ۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے

باقی صہ ۴۶ پر

قائداعظم کی مخالفت

ہر وہ مسلمان جس نے تحریک پاکستان کا بغور مطالعہ کیا ہے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس تحریک کے آغاز سے قبل، برصغیر ہند کے مسلمانوں کا سفینۂ حیات کس گرداب بلا کا شکار تھا اور جمہوریت کے مغربی تصور کی بلاخیز موجیں کس تندی سے اُسے ابدی غلامی اور موت کے ہولناک دہانے کی طرف بہائے چلی جا رہی تھیں۔ اس سانحۂ قیامت میں قائداعظم کی مفکرانہ اندیشی اور مرض شناسی نے ملت کو خودبینی اور خودنگری کے احساس سے نشاۃ ثانیہ کے جس مقام محمود تک پہنچایا اسے ہماری آئندہ نسلیں اور تاریخ فراموش نہیں کر سکیں گی۔

لیکن اپنی بانائیوں کی اس خوش گوار اور جان نواز داستان میں اپنی ہی ملت کے اُن شوریدہ بختوں کی مخالفت کا الم انگیز باب بھی نظر آئے گا جنہوں نے نشاۃ ثانیہ کی اس تاریخی جد و جہد میں اپنی مخصوص بوالہوسیوں کی بنا پر بدترین مخالفت اور دشمنی کا ارتکاب کیا۔ (ان مخالف عناصر میں سے نیشنلسٹ مسلمانوں اور ان کی ہم آہنگ مسلمان جماعتوں کی مخالفت کی تفصیل "قائداعظم" کے عنوان کے تحت الگ آئے گی) لیکن اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ نیشنلسٹ عناصر ایک نہ ایک حد تک کسی سیاسی اصول کے تو پابند تھے، اس لئے یہ تحریک پاکستان اور ملت اسلامیہ کے لئے اس قدر خطرناک ثابت نہیں ہوئے جس قدر کہ ایک دوسرا طائفہ جو اسلامی نظام اور اقامت دین کے مقدس نقاب اوڑھ کر استقلال پاکستان کی جنگ میں افراد ملت کے ذہنوں کو زہر آلود کرنے میں کوشاں رہا۔ اس طائفہ کے مرشد سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تکنیک یہ تھی (اور اب بھی ہے) کہ ایک طرف وہ کانگریس کے نیشنلسٹ مسلمانوں کو مردود قرار دیتے تھے اور دوسری طرف قائداعظم اور ان کے رفقائے کار کے کردار اور خود تحریک پاکستان کو اس انداز سے پیش کرتے تھے جس سے عوام میں نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہوں۔ تقسیم ہند کے بعد نیشنلسٹ عناصر نے شکست خوردگی کے احساس سے پاکستان میں خاموشی سی اختیار کر لی اور یا پھر ہندوستانی شہریت کو قبول کر لیا لیکن

پاکستان کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ سیاسی طالع آزماؤں کا یہ دوسرا گروہ اسلام کے نام پر یہاں اپنے مراکز قائم کر کے پوری بے باکی سے اس نوزائیدہ مملکت کے سادہ لوح مسلمانوں میں فتنہ انگیزی کا زہر پھیلانے میں منظم طور پر سرگرم کار ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی پچھلی تاریخ میں بہت سے طالع آزماؤں نے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کیا اور اس کا پورا فائدہ اٹھایا لیکن وہ فریب اسلامی اصطلاحات کے پردے میں ان نئے صالحین اور ان کے سرخیل نے جس قسم کے ڈرامے ایجاد کئے اس کی مثال ہماری گذشتہ تاریخ میں ناپید نظر آئے گی۔ یوم قائداعظم کی قومی تقریب کے اس مرحلے پر ہم اسے پاکستان کے بہترین مفاد کا تقاضا سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کی کارگذاریوں کی ایک مختصر جھلک ان صفحات میں پیش کر دیں تاکہ پاکستان کی تعمیری جدوجہد کے اس نازک مرحلے پر ملت پاکستان ایک بار پھر اس عنصر کی حقیقت سے متعارف ہو سکے جس کی ہوس اقتدار پہلے تحریک پاکستان کے خلاف فتنہ آرائی اور قیام پاکستان کے بعد اس نے پہلے کہیں بڑھ چڑھ کر "خدائی فوجداروں" کا روپ دھار لیا۔

اس وقت جب کہ قائداعظم مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ اسلامی مملکت کے حصول کے لئے انگریز اور ہندو کے مقابلہ میں صف آرا تھے مودودی صاحب کا فتویٰ یہ تھا کہ

افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا۔ اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہے جیسے دنیا میں دوسری قومیں ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس اسلامی سیاست ہے۔ حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لئے ازالہ حیثیت عرفی سے کم نہیں۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان القرآن جلد ۱۷۔ عدد ۶۔ صفحہ ۴۴۲)

پھر وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور قائداعظم اور ان کے رفقائے کار کے خلاف لکھتے ہیں:-

جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ ان کو تو ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی سے ملتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۳)

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:-

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگرس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے

اور انہی ناموں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے مگر جہاں یہ اسلام اور اس کے کلچر کے حفاظت والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین اعلانیہ توڑے جاتے ہیں۔ اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لئے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔ (ایضاً ص۴۳)

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

کیا وہ اسلامی کلچر جسے کانگرس اور اس کی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے، ایسے ہی رہناؤں کی قیادت میں اسے حکومت الٰہیہ تک پہنچایا جائے گا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ (ایضاً ص۴۴)

اور سنیے:۔

اس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف میں ہے بلکہ بعض تو وہاں بھی بہ رعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا (ایضاً ص۴۴)

مطالبۂ پاکستان کے خلاف افراد قلت میں یہ کہہ کر بدگمانی پیدا کی جاتی کہ

اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ مطبوعہ ترجمان القرآن جلد ۱۸ عدد ۱ ص۴۲)

اس کی مزید وضاحت یوں ہوتی ہے کہ

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومت الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔ (ایضاً ص۲۹)

افترا پردازی اور پھر اس پر مبالغہ آرائی کی انتہا ملاحظہ ہو۔

اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت اور بے باکی کے ساتھ ہر ایسی کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام اس ظلم کی پردہ پوشی کے لئے کافی ہوں گے۔ (ص۳۱)

تحریک پاکستان کی کامیابی کے خلاف شکوک و شبہات پھیلانے کے لئے کہا گیا کہ

اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (صـ۹)

سیاسی کشمکش حصہ سوم کے مقدمے میں تحریک پاکستان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لئے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی و ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ (ملاحظہ ترجمان القرآن جلد ۱۰ عدد ۱ صـ ۱۷۰)

پھر وہ تحریک پاکستان کے لیڈروں کو یوں مخاطب کرتے ہیں :-

..... اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لئے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔

(مولانا مودودی کی تحریک اسلامی صـ۱۵۲)

اور سنئے "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں لکھتے ہیں۔

دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ، ان کا اخلاق پہلے سے زیادہ خراب اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گذرے ہو گئے مختلف خیالات، عقائد، نظریات، اغراض و مقاصد رکھنے والے لوگوں کو جمع کر لیا گیا جو اسلام کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ ہی ایسی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے کہ مسلمانوں کا رہا سہا اسلامی تصور بھی دھندلا ہو گیا۔

(مولانا مودودی کی تحریک اسلامی صـ۱۶۲)

اس سے ذرا آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

قومی تحریک جس انداز میں چلائی جا رہی ہے اس نے مسلمانوں کو اپنی جگہ پر بھی ٹھہرنے نہ دیا۔ بجائے اس کے کہ انہیں کچھ اوپر اٹھایا جاتا بدترین قسم کے لوگ صحافت و قیادت پر قابض ہو گئے۔ (ایضاً صـ۱۶۳)

قیام پاکستان سے قبل تو یہ الزام بازی کہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں نے کسی ریزولیشن یا بیان کے ذریعے یہ واضح نہیں کیا کہ پاکستان اسلامی مملکت ہوگا لیکن قیام پاکستان کے بعد اعتراف شکست کے بجائے پوری ڈھٹائی سے یوں پینترا بدلا جاتا ہے اور فرماتے ہیں کہ

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قیام پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن

میں اس وقت خواہ کچھ بھی ہو کم از کم زبانوں سے انہوں نے ہر سٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ (دستوری سفارشات پر تنقید از سید ابوالاعلیٰ مودودی صہ)

یہی نہیں۔ اس کے بعد یہاں تک جھوٹ بولتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہ کی کہ اس اسلامی مملکت کے حصول کی جدوجہد میں خود یہ گروہ بھی برابر کا (بلکہ دوسروں سے بھی زیادہ) شریک تھا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے ترجمان القرآن (بابت اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء) میں لکھا۔

ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود قائم رہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام بھی چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے۔ بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام زندگی کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

اور اس اسلامی ریاست کی باگ ڈور ان حضرات کے سپرد کر دی جائے!

کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے ان لوگوں کی۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

(بقیہ صہ ۴۳)

عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ اور ہم دنیا کو وہ پیغام امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا اور نوع انسان کی بہبود، مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

ضرورت ملازمت قارئین طلوع اسلام میں سے ایک محترم کو جو فوج میں گیارہ سال تک کوارٹر ماسٹر رہ کر قبل از وقت پنشن لے چکے ہیں ملازمت کی ضرورت ہے سٹور کیپنگ اور سیکیورٹی انچارج کی ذمہ داریوں کا تجربہ رکھتے ہیں اردو اور انگریزی میں لکھ پڑھ بھی سکتے ہیں اگر کسی جگہ ان کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے تو حسب ذیل پتہ پر انہیں مطلع فرما دیجئے۔

صوبیدار محمد شریف - محلہ فتو پورہ - گجرات

(مسلسل)

قائدِ اعظم علیہ رحمۃ اللہ

(۵)

نشانِ منزل کا داعی

● طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو ●

(محترم صفدر سلیمی صاحب)

حیاتِ قائد کے نشیب و فراز اور تحریک پاکستان کے پس منظر سے آگے بڑھتے ہوئے اب ہم براہ راست اس نشانِ منزل تک آ پہنچے ہیں جہاں سے ہماری ملت کا کاروانِ شوق تحریک پاکستان کے کارزاروں میں داخل ہوتا ہے۔ ایک جداگانہ قوم اور اس کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ ——— یہ تھی وہ عظیم معرکہ آرائی جو تحریک پاکستان کے نام سے مارچ ۱۹۴۰ء میں شروع ہوئی اور اگست ۱۹۴۷ء میں اس حسن کارانہ انداز سے حاصل تکمیل کو پہنچی جس کی مثال صدیوں سے ہماری تاریخ میں موجود نہ تھی۔ قائداعظم کی مایہ ناز قیادت اور حسن تدبر کا یہ کس قدر عظیم شاہکار تھا کہ وہ قوم جو چند سال قبل اپنے مسلسل زوال اور انتشار کے باعث غول بیابانی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی ایک واضح نصب العین کا سہارا لے کر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلاب حیات کی فاتح قرار پا گئی جس نے سیاسیات عالم کے نقشے بدل کر رکھ دیئے اور عالم اسلام کی تاریخ کو ایک فردوس گم گشتہ کی بازآفرینیوں سے ہم آغوش کر دیا۔

ایک اہم پیش گوئی

اپنے طویل دورۂ ہند کے خاتمہ پر شہرہ آفاق صحافی بیورلی نکلس نے ۱۹۴۳ء میں بڑی اہم پیشگوئی کی تھی۔ اور آج سوچئے کہ کس قدر حقیقت بدوش تھی یہ پیش گوئی جس میں اس نے بڑے ہی صاف اور واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ

اس بات کا بہت قوی امکان ہے کہ (پاکستان کی) یہ خیالی سلطنت ایک دن اچانک طور پر وجود پذیر ہو کر
دنیا کے نقشے پر اُبھر آئے میں بذاتِ خود ان لوگوں میں سے ہوں جو نہ صرف یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا
بلکہ یہ بھی کہ ایسا ضرور بالضرور ہونا چاہیئے جب بھی ایسا ہوا ایشیا میں قطعاً نئے حالات رونما ہوں گے۔ جن
کی بدولت موجودہ توازنِ قوت پارہ پارہ ہو جائے گا اور دنیا کے ہر ملک کو اپنی پالیسی بدلنی پڑے گی۔

(VERDICT ON INDIA)

اور اگر غور کیجئے تو یہ پیش گوئی درحقیقت ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ کے اس حقیقت کشا اعلان کی روشنی میں تھی جس کا اظہار کرتے ہوئے اس مردِ قلندر نے اس سے بھی تیرہ سال قبل پورے یقین اور مومنانہ اعتماد سے خطبہ الہ آباد میں فرمایا تھا کہ

مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اوائل سنہ ۱۹۴۰ء تک ہماری ملت کے اجتماعی شعور نے سیاساتِ ہند کی جولانگاہ میں جو ارتقائی مراحل طے کئے وہ اس حقیقت تابندہ کے آئینہ دار تھے کہ بہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے ہر اصول اور ہر نقطۂ نظر سے ہم قطعی طور پر الگ اور جداگانہ ملت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس ملی تشخص کو کسی دوسری قومی یا سیاسی وحدت میں مدغم نہیں کیا جا سکتا۔ صدیوں کے قومی زوال اور شکست کے بعد اب وہ ساعت سعید تاریخ کے بابِ عالی پر دستک دے رہی تھی جب کہ نیشنلزم کے خداؤں اور جغرافیائی حد بندیوں میں جکڑی ہوئی اقوامِ عالم کو علی رؤس الاشہاد اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ آئیڈیالوجی کے اشتراک سے کیونکر ایک ملت کا وجود تشکیل پاتا ہے اور اس کی اساس پر کس طرح ایک مملکت کا مطالبہ حاصل تکمیل کو پہنچتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اقبال نے گنگ و جمن کے سنگم پر کھڑے ہو کر جن عالم آرا حقائق کی نقاب کشائی کی تھی دس سال بعد دریائے راوی کی لہریں اُبھر اُبھر کر انہیں جناح کے ہاتھوں محسوس و مشہود پیکروں میں ڈھلتے دیکھ رہی تھیں حسنِ تدبر کی جان نوازیوں کا یہی شاہکار تھا جو ایک محکوم و مجبور قوم کی آزادی و استقلال کا نشان قرار پا گیا اور اسی کی بدولت محمد علی جناح کی گرانمایہ شخصیت ایک نقشِ دوام کی حیثیت سے جریدۂ عالم پر جلوہ بار رہے گی۔

منٹو پارک کا تاریخی اجتماع

دریائے راوی کے کنارے منٹو پارک کے سبزہ زاروں میں مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کا بے مثال قومی دربار دس کروڑ اسلامیانِ ہند کے اسی اجتماعی شعور کا عکسِ جمیل تھا۔ اس تاریخی اجتماع میں دس کروڑ اسلامیانِ ہند کی مربوط امنگیں اور عزائم ایک صاف اور واشگاف نصب العین میں مرکوز ہو گئے اور "قرارداد لاہور" ان کے مطلعِ تقدیر پر صبحِ امید کے درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگا اٹھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس نے ابتلاء آزمائش کی جن ہولناک یورشوں میں نشانِ منزل کا تعین کیا وہ بجائے خود ہماری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش ورق ہے۔ اور یہی وہ نازک مرحلہ تھا جس کی بدولت قائد اعظم کی عظمت کردار،

ان کا حسنِ تدبر، ان کا عزمِ صمیم، سیاسی بصیرت اور قوتِ استقلال پوری آب و تاب سے نکھر کر نگاہوں کے سامنے آگئے یہی کچھ ان کی شہرۂ آفاق کامرانیوں اور فائز المرامیوں کی ضمانت ثابت ہوا اور اسی سے اس حقیقت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ایک قائد اعظم کو کن محکم اور انقلاب آفریں اوصاف کا پیکر ہونا چاہیے۔

ایک خونین مرحلہ

اس اہم اجلاس سے صرف دو روز قبل لاہور میں حکومت پنجاب نے گولیوں کی اندھا دھند فائرنگ کے ذریعے سرزمین لاہور میں وحشت و بربریت کے طوفان حرکت میں لا چکی تھی۔ قدم قدم پہ ہتھکڑیوں کی جھنکار اور بیڑیوں کی نمائش نے اس ہنگامہ خیز شہر کے ہر گلی کوچے کی رونقوں کو خاموش قبرستانوں میں بدل دیا تھا۔ اور اس اجلاس کو ناکام بنانے کے لئے "دانا دشمنوں کی محلاتی سازشیں" اپنا کام کر چکی تھیں لیکن تدبر اور عزم و فراست کی معجز نمائی سمجھئے کہ قائد اعظم کے لاہور میں ورود کے ساتھ ہی سارا نقشہ بدل گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس وحشت ناک فضا میں آزادی و حریت کے نعرے گونج اٹھے اور حیات ملی کا افسردہ و پژمردہ شبستان نئی امنگوں اور عزائم کے چراغوں سے جگمگانے لگا۔ ابتلاء و آزمائش کی تند و تیز آندھیوں اور بگولوں کی برق سامانیوں میں ملت کے سالارِ انقلاب نے جس بے پناہ فراست سے قوم کا رخ آزادی و استقلال کی منزل کی طرف پھیر دیا اس کا حقیقی اندازہ اس روئیداد سے ہو سکے گا جو اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام نے انتہائی حسنِ ترتیب سے اجلاس کا نقشہ کھینچتے ہوئے پیش کی تھی۔ جی چاہتا ہے کہ اس تمام روئیداد کو یہاں من و عن شائع کر دیا جائے لیکن مضمون کی طوالت کا احساس شدت سے عنان گیر ہے کہ ہم زیر نظر موضوع سے متعلق اس میں سے محض چند جھلکیاں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

سالانہ اجلاس کا ملک گیر انتظار

ملت اسلامیہ ہندیہ کے اس تاریخی اور نمائندہ اجتماع کے انتظار میں ملک بھر میں افرادِ ملت کے جذبات و احساسات کی کیفیت کیا تھی طلوع اسلام اس کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> سرزمین پنجاب کا ذرہ ذرہ اُبھرا اُبھرا ۲۱ مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ اسلامی ہند کے گوشے گوشے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے تیاریوں کی خاص اطلاعات موصول ہو رہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور نو کروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جاں فزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پہ ایک آفتابِ تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔ (طلوع اسلام اپریل ۱۹۴۰ء)

وحشت کا دورِ دورہ

اور پھر عین موقع پہ یکایک وزیر اعظم پنجاب نے آتش و خون کی بارش کر کے کرفیو آرڈر اور مارشل لاء کے نفاذ اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ دراز شروع کر کے مسلم لیگ سے جس وفائے عہد کی ضمانت پیش کی اس کی بھی کیفیت سن لیجئے۔

جلوس صدر مسلم لیگ سے مین دو روز قبل شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف واکناف ہند میں پھیل گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلادی گئی ہے شہر پر پولیس اور فوج کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر فرد متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر۔ نہ بھائی کو بھائی کا علم کاروبار بند۔ دل پژمردہ۔ ولولے افسردہ ہمتیں پست۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ہر شخص حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدر جلسہ[1] دہلی میں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں تار پہ تار آرہے ہیں۔ ٹیلیفون پہ ٹیلیفون ہو رہا ہے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا انہیں "مخلصانہ مشورہ" دیا گیا تھا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے[2]۔ (ایضاً)

عظمت کردار کا نقش تابندہ

لاہور کی اس وحشت ناک فضا اور اطراف ہند میں اس کے مذکورہ اثرات سے بالاتر ہو کر قائداعظم نے جس عزم و اعتماد سے اپنا قدم آگے بڑھایا اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے :-

پریشانی اور وحشت کے یہ سامان ایک طرف اور وہ عزم و ہمت کا پیکر دوسری طرف۔ نامساعدت حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں اور روشنی کے اس بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ موقعہ کم ہی آیا ہوگا۔ استقلال اور تدبر کے اس مجسمہ نے یہ سب کچھ سُنا اور دیکھا لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانان ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چور چور ہو جائے گا۔ اس نے تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر ایک طرف رکھ دیا اور اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام اوقات کے مطابق بلا ردوبدل ہوگا۔ البتہ اس سانحہ الم انگیز کے پیش نظر کہ جس نے مسلمانان ہند کے طرب آگین قلوب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا ہے جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے تین گھنٹہ بعد پیکر عزم و استقلال حسب انتظامات سابقہ، اسپیشل ٹرین کے ذریعے عازم لاہور ہو گیا۔ (ایضاً)

فضا بدل گئی

لاہور پہنچ کر پرچم کشائی کی رسم ادا کرتے ہوئے قائداعظم نے قوم کو جو حیات آفریں پیغام دیا وہ اس ماتم کناں شہر میں صور اسرافیل بن کر گونجا اور جس فضا میں کچھ دیر پہلے موت کا سناٹا تھا اور وحشت سی برس رہی تھی اس میں زندگی کے ہنگامے اُبھر آئے۔ طلوع اسلام کے الفاظ میں یہ

---

[1] قائداعظم محمد علی جناح ۔ [2] وزیر اعظم پنجاب کی ساری سازش کا مقصد ہی یہ تھا ۔

انقلاب سامنے لائیے :

سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدہ لاہور پر نور کی کرنیں بن کر برسے۔ اور یاس و حزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاع امید دوڑا دی۔ دلوں میں جیسے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سر نو روشنی پیدا ہو گئی۔ افسردہ چہروں پر خون تازہ کے آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر آئے ۔۔۔۔ ہوا کا رخ بدل گیا اور اس خوف و ہراس کا ردِ عمل جس نے چار روز سے تمام لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا پورے جوش و خروش کی صورت میں نمودار ہوا۔ مغموم دلوں کی وہ آتش خموش جو اتنے دنوں سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی پوری عنان تابی سے بھڑک اٹھی۔ (ایضاً)

سالارِ انقلاب کا مقام بلند

جوش و خروش کی اس فضا میں جہاں منٹو پارک کا گوشہ گوشہ فلک بوس نعروں سے زلزلوں کا نشیمن بن رہا تھا قائد اعظم نے اپنی عظیم ذمہ داریوں کو جس حسن تدبر سے حاصل تکمیل تک پہنچایا اس کا ذکر بھی سنئے :

اس ہنگامۂ بحث و جدل اور اس سیلاب جوش و خروش میں مسٹر جناح نے جس ہمت۔ استقلال۔ عزم راسخ۔ تدبر اور صلاحیت، ضبط و انضباط کا ثبوت دیا۔ آنے والا مورخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تامل پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ ایک "قائد اعظم" کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا رہبر فرزانہ مل جائے اور مستحق صد تحسین ہے وہ انسان جسے مبدأ فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہو جائیں۔ (ایضاً)

اجلاس لاہور کی اہمیت

اجلاس لاہور کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد طلوع اسلام نے لکھا تھا۔

لاہور کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا۔ وہ خوش نصیب انسان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشم خویش دیکھا ہے، محسوس کریں گے کہ انہوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے ساتھ چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ (ایضاً)

راہِ نجات کی نشان دہی

پورے ہندوستان کی نگاہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس پر مرکوز تھیں۔ وائسریگل لاج، وائٹ ہال، آنند بھون، واردھا آشرم سب منٹو پارک سے زعیم اسلامیانِ ہند کا صدارتی اعلان سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔ ہماری قومی تاریخ کا عجیب مرحلہ تھا جب آتش و خون کے ہنگاموں، ہتھکڑیوں کی جھنکار اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے طوفانی ماحول اور قیامت خیز

جوش وخروش میں مسند صدارت سے قائداعظم کی پُررعب آواز پنڈال میں گونجی۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک عظیم قائد اور مدبر کی حیثیت سے ملکی صورت حال پر تبصرہ کیا اور پھر اپنے مخصوص پُراعتماد لہجے میں فرمایا:۔

ہندوستان میں مسئلہ کی اہمیت فرقہ وارانہ نہیں بلکہ یہ مسئلہ ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی نقطہ نظر سے اسے طے کیا جا سکتا ہے جب تک اس اصولی اور بنیادی حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا خواہ کسی قسم کا آئین بھی معرض عمل میں لایا جائے، وہ تباہ کن نتائج پیدا کرے گا۔ اور نہ صرف مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا محرک ثابت ہوگا بلکہ ہندوؤں اور انگریزوں کی بھی۔ برطانوی حکومت اگر سچے خلوص سے اس برصغیر کے باشندوں کی مسرت اور امن و اطمینان کی آرزومند ہے تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو خودمختار ریاستوں میں تقسیم کر کے ان دو قوموں کو اپنی اپنی جداگانہ بلاد اختیار کرنے کا موقع دے۔ یہ ریاستیں کسی اعتبار سے باہمی تصادم کا شکار نہیں ہوں گی بلکہ اس کے برعکس ایک قوم کا دوسری قوم پر سیاسی اور معاشرتی تسلط قائم کرنے کا حریفانہ جذبہ ختم ہو جائے گا اور بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے ان کے دوستانہ مراسم ترقی پذیر ہو سکیں گے۔

قائداعظم کے خطبۂ صدارت کے بعد ملت اسلامیہ کے اسی عظیم اور نمائندہ قومی دربار میں وہ تاریخی قرارداد اپنے حقیقی الفاظ میں منظرعام پر آئی جسے دنیائے سیاست میں پہلے "قرارداد لاہور" کا نام دیا گیا اور ازاں بعد "پاکستان اسکیم" کے نام سے اس نے دس کروڑ اسلامیان ہند کے قومی عزائم کے مرکز و محور کا مقام حاصل کیا۔

۲۴- مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے سکوت نیم شبی میں (ایک بجے شب کے قریب) اس یادگار اجتماع میں آخری خطاب کے دوران زعیم ملت نے فرمایا:۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اسلامیان ہند کی تاریخ میں ایک اہم باب کا آغاز کرے گا۔ مسلم لیگ کا یہ اجلاس ہر اعتبار سے کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اگر یہ واقعہ (سانحہ) پیش نہ آتا تو ایک عظیم الشان جلوس نکالتا اور اسلامیان لاہور کو اپنے ولولہ انگیز شوق اور گرم جوشیوں کے اظہار کا موقع مل جاتا۔ ان کے حریف اس اجلاس کو ہر نوع ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے لیکن انہیں نامراد و خاسر و ناکام لوٹنا پڑا اور یہ اجتماع شایان شان کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ میں خوش ہوں کہ ساری کارروائی پرامن اور خاموش فضا میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک کڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔ ان کا خون کھول رہا تھا۔ ان کی قیمتی جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا لیکن ان حالات کے باوجود آپ نے ثابت کر دیا کہ مسلمان سخت دشمن کے ہجوم میں بھی صبر و استقلال کا دامن نہیں چھوڑتا۔ آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ لاکھوں کے اجتماع میں بھی آپ اپنے امور حسن و خوبی

سے سرانجام دے سکتے ہیں کسی قوم کے لئے اس سے بہتر سند اور کیا ہو سکتی ہے مسلم لیگ کا سار اقتدار اسلامیان پنجاب کے ہاتھ میں تھا اور میں انہیں بخلوص قلب ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے میرے عزائم کو ایک نئی قوت عطا کی ہے تاکہ میں آپ سب کی خدمت کر سکوں۔

شاہی مسجد کے سر بفلک میناروں کے سائے اور مرقد اقبالؒ کے دامن میں آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ سالانہ اجتماع دس کروڑ مسلمانوں کے لئے ایک نشان منزل لے کر آیا اور اس نے ایک آزاد اور خود مختار ملت کی حیثیت سے ہماری آزادی و استقلال کی منزل مقصود متعین کر دی۔ "قرار دادِ لاہور" کا اعلان درحقیقت ان دس کروڑ اسلامیان ہند کے دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان تھا جو ایک طویل مدت سے غول بیابانی کی طرح زوال اور انتشار کی مختلف پگڈنڈیوں پہ بھٹک رہے تھے۔ اور اب قائد اعظم کے حسن تدبیر کی کرشمہ سازیوں نے انہیں فکر و نظر کی وہ ہم آہنگی عطا کر دی تھی جو ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے قیام کی بشارتیں لئے آ رہی تھی۔ اقبالؒ کے قلب مضطر کی بے تابیاں اور دیدۂ تر کی بے خوابیوں کا ماحصل ——— نہیں! بلکہ اس مرد قلندر کے سہانے خوابوں کی تعبیر اب درخشندہ حقائق کی صورت میں منظر عام پہ آ رہی تھی۔

اور دوسری طرف ——— ہماری نشاۃ ثانیہ کے یہ روشن امکانات ہندو سامراج کے گھناؤنے منصوبوں اور مذموم سازشوں کی بساط کو زیر و زبر کئے جا رہے تھے۔ اجتماع لاہور کے اس انقلاب انگیز فیصلے نے گاندھی جی، سی۔ آر۔ اچاریہ، راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو جیسے چوٹی کے ہندو لیڈروں کو بوکھلا کر رکھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مخالفانہ پروپیگنڈے کے ذلیل ترین حربے حرکت میں آ گئے۔ ہندو پریس غم و غصہ کی دیوانگی میں بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کی انتہا تک پہنچ گیا۔ ذمہ وار کانگرسی رہنماؤں کے اخباری بیانات اشتعال انگیزی اور غیر ذمہ داری کے نئے ریکارڈ قائم کرنے پہ اتر آئے۔

عصائے موسوی حرکت میں

قائد اعظمؒ نے یہ سب کچھ خاموشی سے سنا اور ایک عظیم ملت کے کامیاب و کامران قائد کی حیثیت سے اسے صبر و ضبط سے برداشت کیا اور پھر جب محسوس کیا کہ جواب دینے کا وقت آ گیا تو ان کی حقیقت آفریں قوت استدلال عصائے موسوی کی طرح ان رسیوں کو نگلنے کے لئے آگے بڑھی۔ تمام الزام بازیوں کے پرخچے اڑاتے ہوئے انہوں نے اپنے اخباری بیان میں حقیقت پسند دنیا کو یوں مخاطب کیا:—

> میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بیگانگی اور ناگوار ماحول جو ایک گروہ کے دوسرے گروہ پہ اقتدار حاصل کرنے اور زبردستی تسلط جمانے کی آرزوؤں کی پیداوار ہے جب ختم ہو جائے گا تو ایک خوشگوار افہام و تفہیم اور خیر سگالی کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ ملک کی تقسیم متعلقہ علاقوں کی اکثریتوں کو ذمہ داری کا احساس

دلائے گی کہ وہ اقلیتوں میں اپنے تحفظ کا سچا یقین پیدا کریں اور ان کا مکمل اطمینان اور اعتماد حاصل کریں۔

(SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNEH, VOL. I - P.184)

مسٹر راجگوپال اچاریہ کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:-

یقیناً سارا ہندوستان کانگرس کی ملکیت نہیں۔ اور اگر آپ اس کی حقیقی ماں کو پوچھتے ہوں تو وہ دراوڑی ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھئے تو وہ قدیم ترین جنگلی باشندے ہیں۔ وہ نہ تو آریائی تھے اور نہ مسلمان۔ ہندوستان سے متعلق آریاؤں کے دعاوی مسلمانوں سے قوی نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک خاص وقت پر ان سے پہلے آئے تھے .... مسٹر راجگوپال اچاریہ کے بیان اور قرارداد لاہور پر ان کی تنقید سے واضح ہوتا ہے کہ وہ قوائے عقلی سے قطعاً محروم ہو چکے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۱)

۲۷ مئی سنہ ۱۹۴۳ء کو بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس کے نام ایک پیغام میں انہوں نے اپنی ملت پر یہ واضح کیا کہ:-

آل انڈیا مسلم لیگ نے اسلامیان ہند کی صحیح طور پر رہنمائی کی ہے۔ اس نے انہیں ایک پرچم، ایک پلیٹ فارم، ایک پالیسی اور ایک متعین لائحہ عمل عطا کیا ہے اور بالآخر اس نے قرارداد لاہور کے ذریعے مسلم ہندوستان کے لئے منزل مقصود اور نصب العین کی نشاندہی کر دی تاکہ وہ اس کے لئے سرگرم پیکار ہو اور ہر ممکن قربانی سے اسے حاصل کریں۔ اسی کے اندر ان کی حقیقی نجات کا سامان ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۵)

نومبر سنہ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے نئی دہلی کی مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے نام ایک پیغام میں ملت کے شاہین بچوں کو یہ دعوت عمل دی کہ

آج پاکستان ہی ہماری وہ منزل مقصود ہے جس کے لئے ہم برسر جنگ ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو اس کے لئے جانوں کی بازی بھی لگائیں گے۔ اسے سودے بازی کا معاملہ نہ سمجھئے۔ میں نوجوانان ملت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کے لئے کمر کس لیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔ ہماری امیدیں ملت کے نوجوانوں سے وابستہ ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۰۶)

قائداعظم کے ان اعلانات نے ملت کے قلب و نظر کو نئی روشنی عطا کی۔ افراد ملت نے مدتوں کے قومی انتشار اور بے راہ روی کے بعد پہلی بار اپنی منزل مقصود اور اس کے نشانات کو نگاہوں کے سامنے پایا۔ ان کے دلوں میں ذوق سفر کے ولولے اور مشکلات و موانعات سے ٹکرانے کے جبروت و عزائم انگڑائیاں لینے لگے۔ ایک طرف عالمگیر جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور برطانوی سلطنت کا سفینہ ابتلاء و آزمائش کی طوفانی لہروں کے حصار میں تھا اور دوسری طرف ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان حصول پاکستان کی جدوجہد میں اپنے قائد کے اشاروں پر ایک نظام

(باقی صفحہ ۷۱ پر)

ہستی باری تعالےٰ کے سات ثبوت

(ایک سائنس دان کے نقطۂ خیال سے)

ڈاکٹر کریسی ماریسن سابق صدر نیویارک اکیڈمی آف سائنس نے سائنٹیفک نقطۂ نظر سے وجود باری تعالیٰ کے دلائل وشواہد پر ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا جو جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کے ماہنامہ READERS DIGEST میں شائع ہوا۔ اس پر پروفیسر کولسن ایف۔ آر۔ ایس۔ صدر شعبہ ریاضیات آکسفورڈ یونیورسٹی نے یہ رائے ظاہر فرمائی کہ

"زندہ اور شخصی شہادت کی یہ کرن ہر ایسے شخص کے دماغ کو منور کرے گی جو سائنس کے حیرت انگیز انکشافات اور قدرت کے کرشموں پر غور و فکر کرتا ہے۔ کریسی ماریسن کے اس عقیدے اور اس عظیم مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر دوسرے ارباب علم و دانش مزید روشنی ڈال سکتے ہیں اور بعض سائنٹسٹ ایسے بھی ہیں جو اُن کے ان عقائد سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ کائنات کا یہ حیرت افزا اور بے مثل نظم و نسق اور اس کے سامنے انسان کا عجز و عجزہی ہستی واجب الوجود پر ایمان کے ارکان اساسی ہیں۔"

اس رائے کے ساتھ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ مضمون مکرر شائع کیا جائے چنانچہ READERS DIGEST کے ادارے نے اسے اپنی اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں دوبارہ نقل کیا ہے ——— اس دلچسپ اور معلومات آفرین مضمون کا اُردو میں آزاد ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لئے ہم محترم اے۔ ایم۔ انصاری صاحب ریٹائرڈ جج۔ ہائی کورٹ حیدرآباد (دکن) کے شکر گذار ہیں۔ (طلوع اسلام)

ہرچند کہ سائنس اور حکمت نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے لیکن ہم ابھی سائنٹیفک دور کے آغاز ہی میں ہیں۔ آئے دن انکشافات کی ہرنئی کرن صاحبان غور و فکر کے دماغوں کو منور کر رہی ہے اور ایک علیم و خبیر خالق کائنات کی صنعت گری کی تازہ دلیل بنتی جاتی ہے۔ ڈارون کے انتقال کو (۹۰) سال ہو چکے ہیں اس عرصہ میں سائنس نے کئی اہم بالشان

انکشافات کیے گئے ہیں اور اب عقل و حکمت اور علم و یقین کی روح کی بدولت ہم دقوت و آگاہی وجود باری تعالیٰ سے دن بدن قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی حد تک وجود باری تعالیٰ کے ایمان پر میں مندرجہ ذیل سات سائنسی دلائل پیش کر سکتا ہوں۔

اول:- ایک حتمی اور غیر متبدل اصول ریاضیات کے ذریعہ یا ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وجود کائنات اور اس کا نظم و انتظام کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس کا منصوبہ اور تخلیق ایک عظیم تعمیری خرد کی صنعت گری کا نتیجہ ہے۔

مثال کے طور پر دس سکے لے لو اور ان پر ایک سے لے کر دس تک ہندسے ڈال لو۔ پھر انہیں اپنی جیب یا کسی تھیلی میں ڈال کر اچھی طرح ہلا دو۔ اور پھر دیکھو کوشش کرو کہ سارے سکے سلسلہ وار نکلتے چلے آویں۔ ہر بار صرف ایک سکہ نکالو اور نمبر دیکھ کر پھر تھیلی میں ڈال کر ہلاتے جاؤ۔ ریاضی کا اصول اور کوششوں کا تجربہ تمہیں بتا دے گا کہ سکہ نمبروار کو نکالنے میں اوسطاً کم از کم دس کوششیں درکار ہوں گی۔ اور نمبر ایک و دو دونوں کو یکے بعد دیگرے نکالنے میں ایک ہزار کوششوں کا اوسط آئے گا اور تمام سکوں کے سلسلہ وار نکلنے میں کوششوں کا اوسط اسی تناسب سے بڑھتا جائے گا اور نمبر ایک سے لے کر دس تک کے سکوں کو صحیح سلسلہ وار نکالنے کا سو کروڑ کوششوں میں ایک بار موقع آسکے گا۔ اب اسی طریق اور دلیل کو نظم و ضبط کائنات پر منطبق کرو تو معلوم ہوگا کہ استقرار حیات کے لیے اتنی گوناگوں اور بے شمار شرائط کی ٹھیک اور صحیح تناسب کے ساتھ ہم رسانی اور موجودگی درکار ہے جس کا سرانجام کسی اضطراری یا اتفاقی حادثہ میں ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر کرۂ ارضی ہی کو لے لو۔ یہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتا ہے۔ جانتے ہو کیا ہو جاتا اگر یہ رفتار بجائے ایک ہزار کے صرف ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی؟ ہمارے دن اور ہماری راتیں جو اب قریب قریب اکثر قطعاتِ ارضی میں برابر اور بارہ گھنٹہ کی ہیں دس گنا لمبے ہو جاتے۔ اس طویل عرصہ میں تپتے ہوئے سورج کی تمازت ساری نباتات کو جھلس کر رکھ دیتی۔ اگر کوئی ٹہنی یا کونپل کسی وجہ سے بچ بھی جاتی تو طویل سرد راتیں میں جاڑے سے اکڑ کر منجمد اور تلف ہو جاتی!

اسی طرح سورج کی کیفیت پر جو ساری حیات کا سرچشمہ ہے غور کرو۔ حساب لگایا گیا ہے کہ اس کی سطح پر حرارت کی مقدار زیادہ دس ہزار ڈگری فارن ہائیٹ ہوتی ہے۔ یہ کرۂ ارضی جس پر ہم رہتے سہتے ہیں سورج سے ٹھیک اتنی دوری پر رکھا گیا ہے کہ اس کی ناروائی ہمیں صرف اس کی اتنی ہی گرمی پہنچاتی ہے جو حیات کے لیے ضروری اور کافی ہے۔ اب اگر سورج اپنی نصف حرارت زائل کر دے تو ہم منجمد ہو کر رہ جائیں اور اگر اس حرارت میں بقدر نصف اور اضافہ ہو جائے تو ہم جل بھن کر کباب ہو جائیں!

یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ کرۂ ارضی کے محور کا جھکاؤ ۲۳ ڈگری ہے۔ اسی کی وجہ سے مختلف موسم وجود میں آتے ہیں۔ اگر وہ ٹھیک اسی طرح اور اسی زاویہ پر جھکا ہوا نہ ہوتا تو سمندروں کے بخارات شمال سے جنوب کی جانب پھیلتے جاتے اور سارے براعظم برف کے تودوں میں دب کر رہ جاتے۔ اسی طرح چاند اور زمین کے مابین اب جو فاصلہ ہے اگر گھٹ کر صرف پچاس ہزار میل ہو جائے تو جوار بھاٹے میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ دن میں دو مرتبہ تمام براعظم غرقاب ہو جائیں اور یہ عظیم الشان پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بہہ جائیں۔ یا کرۂ ارضی کی ساری سطح اگر دس فٹ اور بلند ہوتی تو آکسیجن جس کے بغیر حیات ممکن نہیں موجود ہی نہ ہوتی۔ یا سمندر کی تہ چند اور فٹ زیادہ عمیق ہوتی تو کاربن ڈائی آکسائیڈ CARBON DI OXIDE اور آکسیجن اس میں جذب و تحلیل ہو جاتے اور نباتات کا وجود نابود ہو جاتا۔ اسی طرح کرۂ ہوائی ذرا ہلکا پھلکا ہوتا تو کروڑوں شہاب ثاقب جو اب خلا ہی میں جل بجھ کر راکھ ہو جاتے ہیں کرۂ ارض سے جگہ جگہ ٹکراتے اور ہر طرف شعلے بھڑکا دیتے۔ یہ اور ان جیسی بیسیوں مثالیں ہیں جن پر غور کرنے سے مبرہن ہوتا ہے کہ ہمارا کرۂ ارض یوں ہی خود بخود یا اتفاقاً معرضِ وجود میں نہیں آگیا۔ بلکہ ایک عظیم الشان منصوبے اور انتظام کا نتیجہ ہے!

دوم:- غایتِ حیات کی کامیابی کے اسباب و ذرائع کا بہم و فراہم کیا جانا ایک ہمہ گیر عقل کُل کا مظہر ہے حیات کے رموز و اسرار کی تہ تک ابھی کوئی نہیں پہنچ سکا ہے۔ اس کا نہ کوئی وزن ہے اور نہ سمت و جہت لیکن اس میں قوت ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ایک ننھے پودے کی نرم و نازک بڑھتی ہوئی جڑیں کس طرح رفتہ رفتہ سخت سے سخت چٹانوں کا سینہ چاک کر کے اپنی راہ نکال لیتی ہیں۔ اب تو حیات نے سمندر زمین اور ہوا کو مسخر بھی کر لیا ہے اور قدرت کے سارے عناصر پر قابو پاتی جا رہی ہے انہیں مجبور کئے جاتی ہے کہ اپنے آپ کو تحلیل کر کے از سر نو متشکل ہوں۔

اب ذرا پروٹو پلازم (PROTO PLASM) یعنی مادۂ حیات کے خلیہ پر غور کرو۔ یہ کتنا ننھا بجلی کی طرح صاف و شفاف ہے اور کس طرح سورج سے اپنی توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہ خوردترین خلیہ، یہ شفاف ہیولا سا ننھا قطرہ کس طرح جرثومِ حیات کو اپنے بطن میں تھامے ہوئے ہے اور کس طرح دنیا کی ہر چھوٹی بڑی جاندار شے کو قوتِ حیات تقسیم کرتا ہے۔ اس ننھے منے قطرہ کی قوتیں ساری نباتات، حیوانات اور انسانوں کی قوت سے بڑھی چڑھی ہوئی ہیں کیونکہ یہی ساری حیات کا منبع ہے۔ نیچر یقیناً حیات کو خلق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور آگ میں جھلسی ہوئی چٹانوں اور بے نمک سمندروں سے تو یہ اہتمام نہیں ہو سکتا سو حیات کو پیدا کرنے والا ہے کون؟ ربّ السمٰوٰت والارض کے سوا کوئی اور نہیں!

سوم:- عقلِ حیوانی ببانگِ دہل ایک احسن الخالقین کے وجود کا اعتراف کر رہی ہے جس نے

حشرات الارض کی سی حقیر و بے بس مخلوق کو جبلّت سے سرفراز کر کے اُن کے بقاء اور تحفظ کا بندوبست کر دیا ہے ورنہ یہ بے بس اور بے آسرا رہ جاتے۔

مثلاً سامن مچھلی (SALMON) کا تذکرہ سیاحتِ تخیل کی کارستانی نہیں بلکہ ایک حقیقت واقعی ہے۔ ہر نوزائیدہ سامن لازماً کچھ عرصہ بڑے سمندر میں جا کر بسر کرتی ہے۔ پھر اُسی دریا کے کنارے واپس آجاتی ہے جس میں معاون ندی ملتی ہے یا جھیل ہوتی ہے جس میں اس کی آفرینش ہوئی تھی۔ غور کیجئے کہ آخر اس نقل و حرکت میں کون اس کا راہبر و رہنما ہوتا ہے۔ جو ٹھیک وقت پر اُسے صحیح ٹھکانے پر پہنچا دیتا ہے؟ اگر تم اُسے ایک جگہ سے نکال کر دوسری معاون ندی میں منتقل کر دو تو وہ فوراً محسوس کر لیتی ہے کہ وہ غلط جگہ لائی گئی ہے چنانچہ وہ فوراً بڑے دریا کی طرف لوٹتی ہے اور اس کے دھارے پر چلتی ہوئی اُسی اصل معاون ندی میں پہنچ جاتی ہے جہاں اُس کا مرز بوم ہے۔ اور ایل مچھلی (ECL) کے حیرت انگیز نقل مقام کے مسئلہ کا حل تو اور بھی وقت طلب ہے۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے پر مچھلیاں ادھر اُدھر کی ساری جھیلوں اور ندیوں سے چل پڑتی ہیں اور یورپ سے ہزارہا میل دور کا فاصلہ سمندر کی راہ طے کر کے جزیرہ برمیوڈا (BERMUDA) کے پاس جہاں سمندر نہایت عمیق ہے سب یکجا جمع ہو جاتی ہیں۔ اور مقررہ وقت پر انڈے بچے دینے کے بعد خود ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے نوزائیدہ بچے جن کے لئے علم و وقوف کا کوئی ذریعہ بجز اس احساس کے نہیں ہوتا کہ وہ ایسی جگہ ہیں جہاں انہیں رہنا نہیں چاہئے، وہاں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اپنی سواحل پر پہنچتے ہیں جہاں سے ان کے مورث روانہ ہوئے تھے بلکہ آگے چل کر ان ندیوں اور جھیلوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کی مائیں ہجرت کر کے نکلی تھیں۔ اس طرح یہ مقام باری باری خالی اور آباد ہوتے جاتے ہیں۔ اور دوسرے موسم میں یہی عمل جاری رہتا ہے اور پھر وہی نقل و حرکت سمندر کی جانب عمل میں آتی ہے۔ آخر ان کا معلم کون ہے؟

آپ جانتے ہوں گے کہ بعض زن ڈکوری کی غذا جھینگر یا چھوٹی ٹڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ اپنے شکار کو اس طرح زیر کرتی ہیں کہ وہ مر نہیں جاتے۔ پھر انہیں گھسیٹ کر اپنے سوراخوں میں لے جاتی ہیں۔ اور اس کے ایک خاص حصہ جسم پر اس طرح ڈنک مارتی ہیں کہ کیڑا مرتا نہیں بلکہ بے بس اور بے سُدھ ہو جاتا ہے۔ ڈکوری شکار کو اپنی حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہے جیسے ہم سرد خانوں میں گوشت وغیرہ کے تحفظ کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس اہتمام کے بعد ڈکوری کہیں پاس ہی انڈے دیتی ہے۔ چند روز میں بچے نکل آتے ہیں وہ اس کیڑے کو ایسے ڈھب سے کتر کتر کر کھاتے ہیں کہ وہ مر نہیں جاتا۔ ورنہ مُردہ کیڑے کا گوشت تو ان کے حق میں زہر ہلاہل ہے۔ یہ بچے جب ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی ماں وہاں سے اُڑ کر چلی جاتی ہے اور بچوں کی صورت بھی نہیں دیکھتی یہاں تک کہ کہیں دور جا کر مر جاتی ہے۔ یہ سب ایک موہبت ہے کائنات کے پروردگار کی ورنہ اس پُر اسرار طریق حیات کی

اس تاویل سے توجیہ نہیں ہوتی کہ فطرت میں ماحول خود مخلوق کو موقع کی نزاکت سے نمٹنا سکھا دیتا ہے۔

چہارم:۔ حیوانی جبلت کے علاوہ انسان میں کچھ اور ودیعت کیا گیا ہے اور وہ ہے شعور و خرد۔

انسان کو چھوڑ کر کسی اور ذی حیات میں ایک سے دس تک گننے یا تعداد کی ماہیت کو سمجھنے کا شعور و سلیقہ اب تک سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جبلت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی مگر وہ حیات کی موسیقی میں ایک ٹھہرے میٹھا اور سامعہ نواز لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن دماغ انسانی میں دنیا بھر کے سازوں کے پردے اور اَن گنت نغمے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ نہ کسی مثال کی ضرورت ہے نہ مزید گفتگو کی عقل و شعور کی بدولت ہی انسان اشرف المخلوقات ہے اور اپنے آپ کو ایسا سمجھتا بھی ہے۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس میں عقلِ مطلق ہی کا پرتو ہے۔

پنجم:۔ جرثومہ حیات میں جو زندگی کے سارے انتظامات ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ ڈارون کو وہ پوری طرح معلوم نہ تھے۔ صرف (GENES) یعنی مادۂ حیات کے تحیر خیز انکشافات ہی اس کی مثال کے لیے کافی ہیں جن کا ہمیں کافی وقوف ہو چکا ہے۔

یہ (GENES) اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان سے زیادہ چھوٹی کسی چیز کا تصور ہی ممکن نہیں چنانچہ اگر ساری دنیا کی آبادی کے (GENES) کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو ایک انگشتانہ بھی نہ بھر سکے گا۔ اس کے باوجود کہ یہ خورد ترین ذراتِ حیات اور ان کے ساتھی کروموسم (CHROMOSOMS) ہر زندہ خلیہ میں موجود رہتے ہیں اور حیوانی و نباتاتی ہستیوں میں خصوصیاتِ ذاتی کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ آخر یہ کیونکر لا تعداد اسلاف کا مخزن بنتے ہیں اور کیونکر اتنی ذرا سی گنجائش میں ہر ہستی کی نفسیات سموئے ہوئے اور محفوظ رکھتے ہیں؟ خلیہ کے بطن ہی میں (GENES) کے ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔ آخر یہ چند ملین ایٹم کا ذخیرہ یعنی (GENES) صفحہ ارضی کے تمام حیوانات و نباتات کی حیات اور اس کی خصوصیات پر کس طرح قابو رکھتے ہیں؟ اس سے ایک زبردست شہادت مہیا ہوتی ہے اس عظیم الشان اور کامل دانائی کی جو صرف عقلِ خالقِ عالم کی ہو سکتی ہے۔ کوئی اور ذات اس عظیم بندوبست کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

ششم:۔ کارخانہ فطرت میں جو فراہمی ضروریات اور بے ضرورت صرف سے احتیاط کا اصول کارفرما ہے اس سے ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایک ذاتِ علیم و خبیر کی بے نہایت اور پیش بیں دانش ہی سے ویسا اہتمام ممکن ہے۔

کئی سال کا واقعہ ہے کہ آسٹریلیا میں کھیتوں کی حفاظت کے لئے تھوہر (CACTUS) کی باڑیں لگائی جاتی تھیں اس ملک میں ایسے جانور یا کیڑے تھے نہیں تھے جو اسے کھا سکتے ہوں۔ اس لئے یہ

بے تحاشا پھیلتی گئی اور کچھ ایسی سرعت سے پھیلی اور بڑھی کہ چند ہی برسوں میں بڑے بڑے رقبے اراضی کے اس کی دستبرد میں آگئے۔ جن کا مجموعی رقبہ انگلستان کے پورے رقبے کے لگ بھگ تک پہنچ گیا حتیٰ کہ قصبوں اور شہروں تک اسی کا جال بچھ گیا۔ اس بلائے بے درماں سے لوگ سراسیمہ ہو کر شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور بستیاں ویران ہوگئیں اور بے شمار مزرعے ان کی لپیٹ میں آگئے۔ اس کے مداوا کے لئے ماہرین حشرات الارض جمع ہوئے اور بعد مشورت ساری دنیا میں ادھر ادھر ایک ایسی چیز کی دریافت اور تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو تھوہر سے انہیں نجات دلا سکے اور وہ قابو میں لائی جا سکے۔ بالآخر انہیں ایک کیڑا ایسا دستیاب ہو گیا، جس کی غذا صرف تھوہر تھی اور سوائے اس کے کسی اور شے کو چھوتا تک نہ تھا۔ ان کیڑوں کی پود (نسل) بھی بڑی تیزی سے بڑھتی تھی۔ اور آسٹریلیا میں ان کیڑوں کا کوئی دشمن بھی نہ تھا۔ اس طرح ان کیڑوں نے انسان کو ایک خوفناک نباتاتی بلا سے نجات دلائی۔ اب تھوہر کی پوزیشن اس ملک میں پورے قابو میں آگئی ہے اور کیڑے بھی اس بندوبست کے لئے مناسب اور کافی تعداد میں ہیں اور تھوہر کے حملوں کا اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس مثال سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کائنات میں آزار دہ اور نامساعد احوال کے دور کرنے کے وسائل بھی ہر طرف موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اتنی تیزی سے نسل بڑھانے والے کیڑوں نے ہمارے کرۂ ارض کیوں اپنی آماجگاہ نہیں بنا لیا اور ساری نباتات نہیں چٹ کر ڈالی۔ اول تو کیڑے دوسری سبزی پر نظر نہیں ڈالتے۔ دوسرے یہ کہ حشرات الارض کے جسم میں شکل اور حیوانات کے پھیپھڑے نہیں ہوتے۔ ان کی جگہ نالیاں ہوتی ہیں جن سے وہ سانس لیتے ہیں لیکن جوں جوں یہ کیڑے بڑے ہوتے جاتے ہیں سانس کی نالیاں اسی مناسبت سے بڑی نہیں ہوتیں۔ اس لئے کیڑے مکوڑے بڑی جسامت کے ہو نہیں سکتے اور جلد جلد تلف ہو جاتے ہیں۔ قدرت کے اسی قسم کے فراہم کئے ہوئے موانعات کیڑوں مکوڑوں کی تعداد کو محدود کئے رکھتے ہیں۔ اگر قدرت نے ایسا معنوی بندوبست نہ کیا ہوتا تو انسان کا وجود محال ہو جاتا۔ ذرا تصور تو کیجئے ایک ایسی بھڑ کا جو شیر جیتنی بڑی ہو ؟ !

ہشتم :- قلب انسانی میں خدا کا کھوج اور ذہن میں اس کا تصور خود وجود باری تعالےٰ پر دال ہے۔

ذہن انسانی میں خدا کا تخیل خود ایک الوہیاتی قوت کا کرشمہ ہے جس سے کائنات کی دوسری تمام ہستیاں یکسر محروم ہیں۔ اسی قوت کو ہم تصور کہتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ انسان، اور صرف انسان ہی ان دیکھی اشیاء کا تصور کر سکتا ہے اور اس کے وجود کی شہادت بھی پا لیتا ہے۔ اس قوت کا دائرہ عمل لامحدود ہے اور بلاشبہ کمال کو پہنچا ہوا تفکر جب ایک روحانی حقیقت بن جاتا ہے تو اُسے کارگاہ فطرت میں ایک عظیم منصوبے اور مقصدیت کے شواہد ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ عظیم اہمیت مبرہن ہو جاتی ہے کہ ماورائی دنیا کیا اور کیسی ہے ! نیز یہ حقیقت کہ خدا ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے۔ اور کسی سے وہ اتنا قریب نہیں ہے جتنا کہ وہ قلب انسانی سے ہے۔

الغرض وجودِ باری تعالےٰ سائنس اور تصورات کی ایک حقیقت ہے اور جیسا کہ زبور میں کہا گیا ہے۔ آسمان کی فضائے بسیط اس کی عظمت و شان کا اعلان ہے اور زمین اس کی بے مثال صنعت گری کا ثبوت۔ دونوں اس کی تقدیس و تمجید میں مصروف ہیں۔

طلوعِ اسلام - یہ نامور سائنس دان اپنے عمر بھر کے تجربات و مشاہدات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ تفسیر ہے قرآن کریم کی ایک آیت کی۔ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ فرعون نے حضرت موسےٰ سے پوچھا کہ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (۲۰/۴۹)۔ اے موسےٰ! تم دونوں (بھائیوں) کا نشوونما کرنے والا کون ہے؟ اس سوال میں رب کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے یعنی جو ہستی اتنی عظیم کارخانہ کائنات کی نشوونما کا انتظام کر رہی ہے۔ جواب میں کہا گیا۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰/۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی پیدائش عطا کی اور پھر اسے (اپنی منزلِ تک پہنچنے کی) راہ دکھائی۔ یہی وہ خالق کی عطا کردہ راہ نمائی ہے جس سے کائنات کی ہر شے کی کیفیت یہ ہے کہ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (۲۴/۴۱) وہ اپنے فرائضِ حیات سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے حصول کے لئے جہد و جہد کے دوائر سے پوری طرح باخبر

ریڈرز ڈائجسٹ کی اسی اشاعت میں ایک اور مضمون بھی شائع ہوا ہے جو اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بچہ اپنی پیدائش کے پہلے سال میں زندہ کس طرح رہتا ہے اور اس کی مختلف صلاحیتوں کی نشوونما کیسے ہوتی ہے۔ مضمون نگار کا نام ہے (J . D . RATCLIFF)۔ اس مضمون کے بعض اہم نکات ملاحظہ فرمایئے:-

(۱) بچہ پیدا ہوتا ہے تو قریب قریب اندھا اور بہرہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی آنکھیں اور کان معمول کے مطابق کام کریں تو روشنی کی چمک اس کی بینائی ختم کر دے جائے اور تیز آوازیں اس کے کان کے پردے پھاڑ دیں۔ وہ دن بھر آنکھیں بند کئے پڑا رہتا ہے۔ جہاں تک کانوں کا تعلق ہے، ان کے اندر قدرت ایک مائع سا مادہ ڈال دیتی ہے تاکہ باہر کی آواز نرم ہو کر اندر پہنچے۔ جوں جوں اس کے کان آواز کے عادی ہوتے جاتے ہیں، یہ مادہ خشک ہوتا جاتا ہے۔

(۲) بچہ رحمِ مادر میں تھا تو اسے آکسیجن (جس پر زندگی کا دار و مدار ہے) ماں کے خون سے ملتی جاتی تھی۔ پیدائش کے بعد اسے آکسیجن سانس کے ذریعے حاصل کرنی ہوتی ہے لیکن اس کے پھیپھڑوں میں ابتدا اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ وہ پورے طور پر کھل سکیں۔ اس کے لئے قدرت دو انتظام کرتی ہے۔ ایک تو اس کے خون میں سرخ ذرات کی تعداد، بالغ انسان کے مقابلہ میں ڈیوڑھی ہوتی ہے۔ ان ذرات کے ذریعے اسے آکسیجن ملتی ہے۔ اور دوسرے اس کا دل، بالغ انسان کے مقابلہ میں دگنی رفتار سے کام کرتا ہے تاکہ آکسیجن جلد جلد خون میں صحیح چلی جائے۔

(۳) جب اس کے خون میں کاربن ڈائی آکسائڈ بڑھ جاتی ہے تو وہ جمائیاں لینے لگ جاتا ہے۔ اس طرح اسے آکسیجن زیادہ مقدار میں مل جاتی ہے۔ جب اس کے سانس کی نالیوں میں کوئی مانع شے اٹکتی ہے تو وہ کھانسنے لگ جاتا ہے۔ اس سے وہ نالیاں صاف ہو جاتی ہیں۔ بچے کی چھاتیوں میں (خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی) کچھ نہ کچھ دودھ کی مقدار بھی جمع ہوتی ہے۔

(۴) پیدائش کے وقت اس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے تاکہ اس میں دماغی خلیات کی مقدار زیادہ سما سکے۔ اس کی ٹانگیں اور بازو چھوٹے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی ابھی کچھ وقت تک ضرورت نہیں پڑتی۔ پیٹ بڑا ہوتا ہے تاکہ اس میں بڑے سائز کا جگر سما سکے۔ جگر کا بڑا ہونا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس سے فولاد، چربی وغیرہ کی کمی پوری ہو سکے۔ اس کی ٹھوڑی اندر کی طرف دھنسی ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ ہو تو اس کا منہ ماں کی چھاتیوں تک نہ پہنچ سکے اور وہ دودھ نہ پی سکے۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے، ٹھوڑی اوپر کو ابھرتی آتی ہے۔

(۵) ابتدا میں اس کے احساسات کمزور ہوتے ہیں تاکہ وہ نامساعد حالات کا شدید احساس نہ کر سکے۔ لیکن سونگھنے اور چکھنے کی قوت تیز ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے سامانِ پرورش کے مضرت رساں عناصر کو بھانپ سکے۔ بچہ شروع شروع میں قریب دو گھنٹہ روزانہ روتا ہے۔ اس سے اس کے پھیپھڑوں کی ورزش ہو جاتی ہے لیکن یہ رونا بغیر آنسوؤں کے ہوتا ہے۔ فطرت نے ابھی آنسو پیدا ہی نہیں کئے ہوتے۔

(۶) بچے کا دماغ اسے سب سے پہلے مسکرانا سکھاتا ہے۔ یہی وہ "حسین" حربہ ہے جس سے وہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا اور اس طرح اپنی حفاظت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ جوں جوں اس کے احساسات بڑھتے ہیں، اس کے رونے کے انداز میں فرق ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بھوک کا رونا اور قسم کا، تکلیف کا رونا اور انداز کا۔ سونے کے لئے رونا اور ڈھب کا۔ تنہائی کے ڈر کا رونا اور قسم کا ——— رونے کے یہی اقسام ہیں جو بعد میں "بولنے" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(۷) اس کے بڑھنے پھولنے پھیلنے کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے جس رفتار سے وہ اس عمر میں بڑھتا ہے اگر وہ رفتار عمر بھر قائم رہے تو پچاس برس کی عمر میں اس کا وزن قریب چودہ من تک پہنچ جائے اور اس کا قد پچاس فٹ کا ہو جائے۔

طلوع اسلام :- کیا یہ انتظامات کسی "اندھی فطرت" کے کرشمے ہو سکتے ہیں؟ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

رابطۂ باہمی

رپورٹیں

لنڈن

(احباب کو یاد ہوگا کہ گذشتہ اگست میں بزم کراچی کے ترجمان میاں عبدالخالق صاحب یورپ کے دورے پر روانہ ہوئے تو ہم نے اعلان کیا تھا کہ میاں صاحب موصوف اپنے کاروباری مقصد کے ساتھ ہی ساتھ طلوع اسلام کے قرآنی پیغام کے سفیر بن کر جا رہے ہیں۔ یورپ میں میاں صاحب کی مساعی مبارک ثابت ہو رہی ہیں چنانچہ لنڈن میں بزم کے قیام اور اس کی روئیداد کے سلسلے میں ان کا آمدہ خط حسب ذیل ہے ——— طلوع اسلام)

السلام علیکم۔ نہایت مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں۔ کہ گذشتہ ۲۰ نومبر کو بفضل خدا بزم طلوع اسلام لنڈن قائم ہو چکی ہے۔ اس اجتماع میں خاص ہم خیال احباب کو دعوت دی گئی تھی چنانچہ ۱۵ احباب شریک ہوئے جن میں سے جرمن کے ممتاز تاجر محترم محمود الٰہی صاحب اور کمال غزنوی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سب سے پہلے محترم پرویز صاحب کی تقریر "رحمۃ اللعالمین" ٹیپ ریکارڈ پر سنائی گئی جسے حاضرین نے بڑے غور سے سنا اور بے حد پسند کیا۔ بعد ازاں بندہ نے طلوع اسلام کے مسلک سے حاضرین کو متعارف کراتے ہوئے وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ محترم پرویز صاحب کی بیس سالہ کوششوں نے کس طرح پاکستان کی فضا میں قرآنی فکر کو عام کر کے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ بزم طلوع اسلام اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ایک تحریک

ہے جس کا کسی سیاسی پارٹی یا فرقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس ضمن میں بزم طلوع اسلام کراچی کی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی۔ طلوع اسلام کے لٹریچر کا ذکر کرتے ہوئے بندہ نے بتایا کہ محترم پرویز صاحب نے اس قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ پڑھے لکھے طبقہ میں قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں کوئی دشواری نہیں آسکتی۔ حاضرین میں اردو اور انگریزی کے پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ آخر میں متفقہ طور پر مسٹر محمد افضل جہانگیر صاحب کو لنڈن بزم کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ مسٹر محمد افضل جہانگیر صاحب قرآنی فکر سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ عرصہ ۹ سال سے لنڈن میں مقیم ہیں۔ اور آپ الیکٹرونک انجینئر ہیں۔ جو احباب رابطہ پیدا کرنا چاہیں مندرجہ ذیل پتہ پر ان سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

M. A. JAHANGIR , 16. CHALCOT SQUARE

LONDON . N.W. 1.

بزم کی آئندہ میٹنگ ۱۱ دسمبر کو ہو رہی ہے مستقل اقدار پر محترم پرویز صاحب کی تقریر سنائی جاوے گی۔ اس نشست میں محترم گلزار احمد چغتائی صاحب جو بفضل خدا اب روبصحت ہیں شریک ہوں گے۔ چغتائی صاحب کو طلوع اسلام کے لٹریچر پر کافی عبور حاصل ہے۔ اور اس تحریک سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور نئے دوست بھی شریک ہوں گے۔

براہ مہربانی احباب کی اطلاع کے لئے آئندہ پرچہ میں شائع فرما دیں۔ نیز بزم کی منظوری نمائندہ صاحب کو معہ ۵۰ فارم ممبری ارسال فرما دیں۔

برمنگھم اور گلاسگو کے احباب میری آمد کے منتظر ہیں۔ چوہدری رحمت علی صاحب خاص طور پر گلاسگو آنے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ تعالےٰ جلد وہاں پہنچ کر بزم قائم کروں گا۔ انگلینڈ میں اردو لٹریچر کے علاوہ انگریزی پمفلٹس کی زیادہ ضرورت ہے اس لئے نمائندہ صاحب کو بھیجتے رہیں۔

امید ہے کہ آپ نے نمائندہ صاحب کے نام پرچہ طلوع اسلام جاری کر دیا ہوگا۔

کراچی

ہر اتوار کو حسب معمول درس قرآن بذریعہ ٹیپ ریکارڈ سندھ اسمبلی ہال میں جاری ہے۔ حاضری میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اسے زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے دعوت نامے بھی جاری کئے جاتے ہیں۔

طلوع اسلام کے خریداروں کی تعداد یہاں بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور بزم کی یہ مہم انتہائی مفید نتائج پیدا کر رہی ہے۔

گوجرانوالہ

سب کنونشن حیدر آباد کی قرارداد کے مطابق "مجلس عاملہ" کی تشکیل ہو چکی ہے اور وہ براہ راست تمام بزم ہائے طلوع اسلام سے خط و کتابت کے ذریعے اپنا رابطہ قائم کر رہی ہے۔ بزم کے حالیہ اجتماع میں مقامی احباب کے علاوہ مضافات کے احباب نے بھی شرکت کی۔ حیدر آباد سب کنونشن کی روئیداد اور فیصلوں کو تفصیلاً اجلاس میں پیش کیا گیا۔ اجلاس میں خواجہ محمد حسین صاحب ترجمان ضلع کی اہلیہ محترمہ کی ناگہانی وفات پر اظہار تعزیت اور دعائے مغفرت کی گئی۔ خاتمہ اجلاس پر بعض اہم پمفلٹوں کی تقسیم عمل میں لائی گئی۔

رسول نگر (ضلع گوجرانوالہ)

دس تاریخ کو بزم کا اجلاس ہوا۔ نمائندہ بزم خان بہادر قاضی حفیظ الدین صاحب نے گذشتہ اجلاس گوجرانوالہ کی روئیداد پیش کی۔ ترجمان ضلع خواجہ محمد حسین صاحب کی اہلیہ محترمہ کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار اور خواجہ صاحب سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے مرحومہ کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی۔ طلوع اسلام کی خریداری کو آگے بڑھانے پر زور دیا گیا

ساہیوال

بزم اپنی نوعمری کے باوجود بڑی تیزی اور کامیابی سے سرگرم عمل ہے۔ دار المطالعہ کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے جہاں ادارہ کی تمام مطبوعات برائے مطالعہ جمع کر دی گئی ہیں۔ جریدہ "خودی" میں مضامین کی اشاعت جاری ہے اور اس کے ذریعہ قرآنی فکر کو ترقی پذیر ہونے کی سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ سرگودھا کے وکلاء صاحبان سے طلوع اسلام کی قرآنی فکر کے سلسلے میں خاص طور پر رابطہ قائم کیا گیا ہے اور اس کے نتائج بڑے خوش آئند ہیں۔

طلوع اسلام کے خریداروں کی تعداد بڑھانے کے خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے۔

محترم پرویز صاحب ـــــ علامہ اقبالؒ کے دیس میں!

حیدر آباد سب کنونشن۔ پبلک کا ذوق و شوق منتظمین کی مہمان نوازی۔ بزم کراچی کی دریا دلی اور محترم پرویز صاحب کی جادو بیانی سب کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ اسی مقام پر خاکسار نے محترم پرویز صاحب کو سیالکوٹ تشریف لانے کی پیش کش کی جسے آپ نے محبت بھرے الفاظ میں شرف قبولیت بخشا۔

چنانچہ اسی کے مطابق آپ، چوہدری عبدالرحمٰن صاحب کی معیت میں ۴ دسمبر کی سہ پہر سیالکوٹ

تشریف لائے اور محترم ڈاکٹر احمد حسن صاحب کے بنگلہ پر فروکش ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب حسن اخلاق۔ مہمان نوازی اور شیریں کلامی کا مجسمہ ہیں۔ بزم کے اراکین ان کی ہمدردی کے بہت ممنون ہیں۔ قریب گھنٹہ بھر کے بعد محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب کے ہاں دعوت عصرانہ تھی جہاں شہر کے ارباب علم و بصیرت کو مدعو کیا گیا تھا۔ محترم پرویز صاحب کے ساتھ سب کا تعارف کرایا گیا۔ اور محترم موصوف نے استفسارات کے جواب اسلامک آئیڈیالوجی کی وضاحت فرمائی۔ آپ کے بیان کردہ علم و حکمت کے موتی دلوں کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوئے۔ اسی شام کو احاطہ بلند کوآپریٹو میں جلسہ تھا۔ جہاں آپ وقت مقررہ پر تشریف لائے۔ احاطہ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جلسہ زیر صدارت کمیشنر میاں نصیر الدین شروع ہوا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد ڈاکٹر احمد حسن نے معزز مہمان کا تعارف کرایا۔ پھر محترم پرویز صاحب نے "تکذیب دین کون کرتا ہے" کے موضوع پر تقریر شروع کی۔ فاضل اور نبض شناس مقرر کی سحر بیانی سے تو ایک زمانہ واقف۔ مگر سیالکوٹ کی مردم خیز سرزمین کو چوٹی کے لیڈروں کا گہوارہ بننے کا شرف حاصل ہے۔ اسی سرزمین میں پہنچ کر بیسیوں تحریکوں نے دم توڑ دیا۔ اور سینکڑوں شہرت کے فلک و لافلاک پر پہنچ گئیں۔

اسی سرزمین کے ہر طبقہ کے ہونہار فرزند ہمہ تن گوش ہو کر محترم پرویز صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ دین اور تکذیب دین کے نرالے مفہوم پر سر دھن رہے تھے۔ فاضل مقرر نے اچھوتے دلائل اور براہین سے ثابت کر دیا کہ سرمایہ داری کے بت کی پرستش کرنے والے اور غریبوں اور کمزوروں پر عرصہ حیات تنگ کرنے والے ہی تکذیب دین کرتے ہیں۔ ان کی عبادت کس کام آسکتی ہے جو گرتوں کو اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور یہی منشائے ایزدی ہے۔ غرض ۹ بجے جلسہ کامیابی سے ختم ہوا۔

شب کا کھانا محترم ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب کے دولتکدہ پر تھا جنہوں نے نہایت مہربانی سے جلسہ گاہ بزم طلوع اسلام کے سپرد کی تھی۔ دعوت پر تشریف لے گئے۔ کھانے کے بعد محفل دیر تک جمی رہی۔ قومی بیماریوں۔ قانونی موشگافیوں اور دینی تقاضوں پر گفتگو ہوتی رہی۔ پرویز صاحب شگفتہ مزاجی اور سادہ زبان میں عقدہ کشائی کرتے چلے گئے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد محفل برخاست ہوئی۔

۵ تاریخ کی صبح ۷ بجے ڈاکٹر احمد حسن کے بنگلے پر درس کا انتظام تھا۔ ڈاکٹر عالمگیر کے استفسار پر پرویز صاحب نے "ایمان" اور "معراج" کے مفہوم کو جامع الفاظ میں سمجھایا۔ کئی دیگر حضرات نے بھی متعدد سوالات کئے جن کا اطمینان بخش جواب دیا گیا۔ ۸½ بجے کے قریب درس ختم ہوا۔ ڈاکٹر احمد حسن صاحب نے پر تکلف ناشتہ سے محظوظ فرمایا۔

ہم تو رخصت ہو گئے مگر پرویز صاحب کے پاس آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔

۴ بجے بعد دوپہر آپ زنانہ کلب تشریف لے گئے جہاں پر کلب گھر میں معزز خواتین اور کالج کی طالبات کا مجمع تھا۔ پرویز صاحب نے اپنے دلکش انداز میں تعمیر سیرت کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ اور تقریر کے بعد متعدد سوالات کا تشفی بخش جواب دیا گیا۔ اثر انگیزی کا نتیجہ یہ تھا کہ خواتین نے اسی وقت دوبارہ تشریف آوری کے تقاضے شروع کر دیئے۔ ہماری محترم خواتین کا قرآن کریم سے ایسا گہرا شغف ہم سب کے لئے موجب صد فخر و مسرت ہے۔

جناب پرویز صاحب کو جیسے سُنا تھا ویسے ہی پایا۔ بلا کے اَن تھک اور "نوجوان" بزرگ ہیں۔ صبح سے تین بجے تک قرآنی مذاکرات میں مشغول اور زنانہ کلب میں مسلسل ۲ گھنٹے تقریر کرنے کے بعد شام کو مجمع عام میں مسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔

ہمارے معزز مہمان چوہدری عبدالرحمٰن صاحب کی صدارت میں "وحدتِ ملت" پر تقریر شروع ہوئی۔ تقریر کیا تھی، روحی فداہ حضور رسالتمآبؐ کی سیرت مقدسہ اور قرآن پاک کا حسین امتزاج سا تھا۔ شہر کے معزز ترین طبقہ کے حضرات اور طلباء غرضیکہ ہر طبقہ کے مخالف۔ موافق تشریف فرما تھے۔ خواتین کا بھی کافی مجمع تھا۔ مگر سب ہمہ تن گوش اور محو۔

پرویز صاحب دلائل پر دلائل اور آیت پر آیت سے وحدت ملت کی اہمیت ثابت کر رہے تھے۔ یہ فرقہ سازی خدائے واحد کی منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ وہ ایک ہے اور سب کو ایک لڑی میں منسلک دیکھنا چاہتا ہے۔ ذات پات، مذہبی فرقے۔ وطنی حدود۔ یا لسانی طریق۔ سب بُتانِ آذری اور وحدتِ ملت کے راستے میں حائل ہیں اور یہی ہماری بدبختی اور ذلت کی وجہ ہے۔

جلسہ برخاست ہوا۔ تو فوراً ہی کالج کے طلباء جن میں سے کسی ایک نے آپ کی ساری تقریر نوٹ کر لی تھی، آپ سے دستخط لینے سٹیج کی طرف لپکے اور پرویز صاحب کو گھیر لیا اکثر لوگ فرطِ محبت سے ملنے کے لئے اردگرد جمع ہو گئے اور جب تک آپ جلسہ گاہ میں رہے وہ بھی کھڑے رہے۔

جلسہ کے بعد خواجہ محمد انور صاحب کے ہاں دعوت تھی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ کافی حضرات مدعو تھے۔ دو گھنٹے کی تقریر کے بعد پرویز صاحب اب یہاں پھر پھول برسا رہے تھے۔ زبان پر کہیں کوئی لطیفہ ہے کبھی کسی مسئلہ کی گرہ کشائی کر رہے ہیں کبھی کسی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ خواجہ صاحب کا پُرلطف کھانا کھایا جا رہا ہے ساتھ ہی ٹیبل ٹاک" (Table Talk) بھی جاری تھی۔ خواجہ غلام مصطفےٰ صاحب جو میزبانوں میں شامل تھے ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ محترم شجر صاحب طہرانی سیالکوٹ کے چوٹی کے ادیب طبیبؒ اور شاعر بھی یہیں تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر محمد بشیر صاحب وائس چیرمین میونسپل کمیٹی غضب کے ہر دل عزیز واقع ہوئے ہیں ہر محفل میں موجود ہیں دوسروں کی خدمت میں لطف اٹھاتے ہیں۔ خواجہ محمد انور صاحب کی دریادلی سے احباب کا یکجا ہونا ان کے لئے باعثِ مبارک ہے۔ خدا انہیں ایسی مجالس منعقد کرنے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

۶ تاریخ کی صبح کو محترم ڈاکٹر احمد حسین صاحب کے بنگلہ پر بہت سے احباب جمع ہو گئے۔ چند فراخ دل اور عالی حوصلہ

علماء صاحبان بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے پرویز صاحب سے صرف ایک سوال پوچھا اور وہ یہ تھا کہ نماز کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے پہلے نہایت خندہ پیشانی سے مستفسر صاحبان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے معترضین کی عام روش کے خلاف (بخلوص متعلق) سے براہ راست بات کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ نماز فریضۂ خداوندی ہے جس کی ادائیگی ہر مسلمان پر لازم ہے میں حنفی گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اس لئے حنفی طریق کے مطابق نماز ادا کرتا ہوں (پھر مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ دیکھئے! میرے پلنگ کے قریب بچھی ہوئی جائے نماز اس کی شاہد ہے)۔ البتہ میرا مسلک یہ ہے کہ مختلف حضرات جس جس طریق سے اس وقت نماز ادا کرتے ہیں، ان سے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اس کا حق کسی کو نہیں کہ ان طریقوں میں جو مروج چلے آرہے ہیں، کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے یا پانچ کی جگہ تین نمازوں کی تلقین کرے۔ جب خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دوبارہ قیام ہوگا تو اسے دیکھنا ہوگا کہ امت میں وحدتِ عمل کی کیا صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔

محترم مولوی صاحبان اس جواب سے اس قدر مطمئن اور خوش ہوئے کہ انہوں نے رخصت کے وقت مصافحہ پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ نہایت گرمجوشی سے معانقہ بھی فرمایا۔ حاضرین پر ان حضرات کی اس فراخ حوصلگی کا بڑا خوشگوار اثر ہوا خدا ہمارے دیگر علماء حضرات کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لینے کے بجائے اسی طرح بات کی خود تحقیق کر لیا کریں۔

محترم یوسف صاحب کے ہاں صبح کی چائے کا انتظام تھا۔ پرویز صاحب اور چند احباب وہاں تشریف لے گئے چائے کے حسنِ انتظام سے صاحب خانہ کے دل کی کیفیت ظاہر تھی، ۹ بجے محفل برخاست ہوئی۔ اور معزز مہمان وہاں سے رخصت ہوئے اور خواجہ محمد انور صاحب کی دکان پر تشریف لے گئے وہاں انکی فیکٹری دیکھی فٹ بال بنتے دیکھے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، دوران میں جب علامہ اقبال صاحب کا ذکر چھڑا تو گویا کسی نے پرویز صاحب کی رگِ جاں کے زخم کو چھیڑ دیا۔ آپکی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے یہ ایک مختصر سی محفل تھی جس میں محترم خواجہ محمد انور صاحب کے علاوہ خواجہ غلام مصطفےٰ صاحب محمد صدیق لون، لالہ عبدالکریم اور محترم چوہدری عبدالرحمٰن شامل تھے۔ دس بجے کے قریب معزز مہمان واپس تشریف لے گئے۔

آپ آئے اور چلے بھی گئے اور اراکین بزم کو جو کاروبار میں مصروف تھے جی بھر کر باتیں کرنے موقع نہ ملا جس کا انہیں بیحد افسوس ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ بیحد مسرور بھی ہیں کہ یہ اجتماعات اس قدر کامیاب رہے۔ اب اہل سیالکوٹ ہیں اور پرویز صاحب کی دوبارہ تشریف آوری کا انتظار!

خادم محمد منشا اللہ

قارئین طلوع اسلام
ضلع میانوالی توجہ فرمائیں

حافظ عبدالرشید فہمی صاحب پراچہ ضلع میانوالی میں بزم کے قیام میں کوشاں ہیں۔ قارئین میں سے جو احباب قیام بزم کے سلسلے میں محترم حافظ صاحب سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ موصوف کو داؤد خیل **دریا خان** (ضلع میانوالی) کے پتہ پر اطلاع دیں۔ (ناظم ادارہ)

بقیہ قائداعظمؒ صفحہ ۵۶ سے آگے

میں صف آرا ہو چکے تھے۔ اپنی زندگی اور موت کی جنگ میں آقایانِ فرنگ نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اور اس سے متاثر ہو کر وائسرائے ہند نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کے آئندہ آئین میں مسلمانوں کی اہمیت کو پوری طرح پیشِ نظر رکھا جائے گا اور ملک کی حکومت کسی ایسے عنصر کے سپرد نہیں کی جائے گی جس پر انہیں اعتماد نہ ہو۔

سیکرٹری آف سٹیٹ کا اعلان

وائسرائے کے اس اعلان کے ساتھ ہی ۱۴۔ اگست ۱۹۴۰ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیرِ ہند) مسٹر ایمری نے دارالعوام میں مسئلہ ہند پر تقریر کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ

> کانگریس کے اس دعوے کی تردید کرتا ہے (کہ اسے تمام ہندوستان کی طرف سے بولنے کا حق ہے) ہندوستان کی پیچیدہ زندگی کے ایک بہت اہم عنصر کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ دوسرا عنصر دعویٰ کرتا ہے کہ ان کو صرف اقلیت تصور نہ کیا جائے بلکہ وہ ہندوستان کے مستقبل کی پالیسی میں ایک علیحدہ عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان کے آئندہ آئین کی تشکیل کے متعلق جو گفتگو بھی ہو اس سلسلے میں انہیں ایک مستقل قوم تصور کرنا چاہئے۔ یہ سب سے اہم عنصر نو کروڑ افراد پر مشتمل مسلمان قوم ہے۔ جو شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں اکثریت رکھتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ آئینی مذاکرات میں ان کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ بحیثیت ایک مستقل قوم کے متصور کئے جائیں اور وہ نہ سمجھے ہیں کہ ان کے نزدیک وہی دستور قابلِ قبول ہوگا جس میں ایک قوم کی حیثیت سے انہیں ایک عددی اکثریت کے خلاف اپنے سیاسی تشخص کا پورا تحفظ حاصل ہو۔ (انڈین انول رجسٹر ۱۹۴۰ء۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۴۵)

ایک طرف مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت تنظیم اور دوسری طرف حکومت برطانیہ کی طرف سے اس قوت کا اعتراف یہ سب کانگریس کے مہا بھائی ذہن پر بوکھلاہٹ طاری کرنے کے لئے کافی تھا۔ گاندھی جی نے اس موقع پر اپنی مہاتمائی سیاست کے سارے ہتھکنڈوں کو استعمال کیا۔ انہوں نے ہندو پریس کے زور پر مخالفانہ پروپیگنڈے اور افترا پردازیوں کی پرزور مہم چلائی۔ مسلم لیگ کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے یو۔پی اور دیگر صوبوں میں مسلم لیگی لیڈروں کو وزارتوں میں شریک کرنے کے لالچ دیئے اور پھر راج گوپال اچاریہ کے ذریعے یہ پُرفریب پیش کش بھی منظرِ عام پر لائی گئی کہ ملک کی آزادی کی خاطر کانگریس یہ اختیار قائداعظم کے سپرد کرنے کو تیار ہے کہ وہ عبوری گورنمنٹ میں حسبِ منشا اپنا وزیرِ اعظم اور کابینہ نامزد کر سکیں لیکن قائداعظم اور ان کے رفقاء کو اس دامِ تزویر کا شکار نہ بنایا جا سکا۔ اور بساطِ سیاست پر انہوں نے جس مہرے کو بھی حرکت دی وہ قائداعظم کی رعنائی فراست اور حسنِ تدبیر سے مات کھا گیا

علامہ احمد امین مصری مرحوم کی

علمی تاریخی کاوشوں کا شاہکار

اور

اسلام کی سرگذشت کے سلسلہ دراز کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد صاحب عثمانی نے اردو زبان کا لباس پہنایا

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں نے بزم آفاق کو منوّر کیا۔

ضخامت ـــــ نو سو صفحات　　　　قیمت ـــــ آٹھ روپے

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷-بی ـــ شاہ عالم مارکیٹ ـــ لاہور

مسلمان بچّوں کی تربیت

کتاب وسنت کی روشنی میں

مولانا محمّد ظہیر الدین صاحب۔ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم، دیوبند سے تذکرہ کے نام سے جو ماہنامہ شائع ہوتا ہے، قارئین طلوع اسلام کا اُس سے تعارف ہو چکا ہے۔ اس میں عنوان بالا سے ایک مضمون مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ نومبر ۶۰ء کی قسط میں، مسلمان بچّوں کی تربیت کے سلسلہ میں جو بحث سامنے لائی گئی ہے، ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے ہیں تاکہ انھیں اندازہ ہو سکے کہ اس زمانہ میں، جب کہ دنیا کی دوسری قومیں چاند پر کمندیں پھینک رہی ہیں، ہمارے علمائے کرام کن گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہیں۔ (طلوع اسلام)

اس سے پیشتر جو کچھ پیش کیا گیا اس سے اتنی بات نکھر کر سامنے آگئی کہ ختنہ ایک اسلامی شعار ہے جس کی ادائیگی مسلمانوں کا مخصوص شیوہ ہے۔ اس کے فوائد اہل علم نے مختلف انداز میں بیان کئے ہیں جس کا قدر مشترک یہ ہے کہ اس سے بے حد فائدے ہیں انسان میں اس کی وجہ سے صفائی، پاکی اور لذت میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ شرح سفر السعادت میں ہے۔

امام فخر الدین رازی نے ختنہ کے مشروع ہونے کے سلسلہ میں نکتہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ حشفہ جب تک جھلی میں چھپا رہتا ہے نرم ہوتا ہے اور مباشرت میں مرد کو زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے اور جب حشفہ کے اوپر کی جھلی کاٹ دی جاتی ہے تو یہیں سختی آجاتی ہے اور اس سختی کی وجہ سے لذت میں کمی واقع ہو جاتی ہے مختصر یہ کہ چھپے ہوئے حصّہ سے لمس میں لذت کا احساس پورے طور پر ہوتا ہے باعتبار کھلے ہوئے حصہ کے جیسا کہ زبان اور ہونٹ کی حالت سے تجربہ کیا جاتا ہے اور اسلام ایک متوسط و معتدل دین ہے جو افراط و تفریط کے درمیان ہے لذت میں بھی

اعتدال پیدا کرتا ہے، ختم نہیں کرتا اور ختنہ سے اعتدال پیدا ہوتا ہے نہ افراط اور نہ تفریط۔ (صفحہ ۳۸۴)

ختنہ کے فوائد اور بھی لوگوں نے لکھے ہیں۔ یہاں تفصیل میں جانا نہیں ہے۔ پہلے بعض حدیث میں یہ گذر چکا ہے کہ ختنہ کے متعلق فرمایا گیا کہ ساتویں دن مسنون ہے۔ مکحول شامی (تابعی) کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لڑکے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ختنہ ساتویں دن کیا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تیرھویں سال میں چنانچہ یہی طریقہ ان کی اولاد میں باقی رہا یعنی عام طور سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان میں اسی عمر میں ختنہ کرتے کراتے رہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنینؓ کا ختنہ ساتویں دن کرایا۔ (جمع الفوائد صفحہ ۱۲۱ - ج ۱)

اس طرح کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ختنہ ساتویں دن ہونا چاہیئے اور مسنون یہی ہے اور تجربہ سے بھی یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ساتویں دن کا ختنہ بچہ کے لئے آرام دہ ہوتا ہے اور والد کے لئے بھی اچھا ہوتا ہے کہ وہ عقیقہ کے ساتھ اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو جاتا ہے

لیکن بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ وفات نبوی کے وقت آپ کی عمر کتنی ہوگی؟ کہا کہ اس وقت میرا ختنہ ہو چکا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا۔

وہ لوگ مرد کا ختنہ اس وقت تک نہیں کرتے تھے جب تک وہ توانا نہ ہو جائے۔ (جمع الفوائد صفحہ ۱۲۱ ج ۱)

جس کا یہ حاصل ہے کہ جب بچہ خوب توانا و مضبوط ہو جاتا تھا تو صحابہ کرامؓ ختنہ کیا کرتے تھے یعنی بالکل بچپنے میں ختنہ نہیں کرایا کرتے تھے۔

بعض فقہا لکھتے ہیں کہ ختنہ کا مستحب وقت سات سال کی عمر سے بارہ سال کی عمر تک ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ پیدائش کے ساتویں دن ختنہ کرایا جائے۔

ختنہ کا مستحب وقت سات سال کی عمر سے بارہ سال کی عمر تک ہے اور یہی مختار ہے اور بعضوں نے کہا کہ پیدائش سے ساتویں دن ختنہ کرنا بھی جائز ہے (عالمگیری صفحہ ۳۹ ج ۵)

صاحب درمختار لکھتے ہیں

ختنہ کا وقت معلوم نہیں ہے البتہ بعضوں نے ختنہ کے لیے سات سال کی عمر بتائی، بعض نے دس سال اور بعض نے کہا انتہائی عمر بارہ سال ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بچہ کی طاقت کا اعتبار ہے اور یہی آخری قول فقہ کے مطابق ہے۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار مسائل شتی صفحہ ۴۷۸ ج ۵)

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رح کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

امام ابو حنیفہ رح نے فرمایا ختنہ کے وقت کا مجھے علم نہیں ہے اور صاحبینؒ سے بھی اس سلسلہ میں کوئی روایت

منقول نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشائخ کا اس باب میں اختلاف ہے۔ (الدر المختار مع الشامی رد المختار مسائل شتی ج ۵ ص ۴۷۸)

فقہا کی اس صراحت سے معلوم ہوا کہ ختنہ کا کوئی وقت امام اعظمؒ یا صاحبین سے منقول نہیں ہے جنہوں نے سات سال کی عمر میں کہا انہوں نے اس حدیث پر قیاس کیا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اپنے بچوں کو نماز کا حکم کرو۔ جب وہ سات سال کے ہو جائیں۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں۔

بعض نے سات سال کی عمر میں ختنہ کے لئے اس وجہ سے کہا کہ اس عمر میں نماز کا حکم دینے کا حکم ہے۔ لہٰذا اسی عمر میں ختنہ کا بھی حکم کیا جائے گا تاکہ نظافت پورے طور پر ہو جائے۔ (ایضاً)

پھر خزانۃ الاکمل کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں۔

اگر اس سے کم عمری ختنہ کرا دیا جائے تو اور بہتر ہے اور اگر اس سے تھوڑی سی عمر بڑھ بھی جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ (ایضاً)

اور جن علماء نے دس سال کی عمر میں ختنہ تجویز کیا ہے انہوں نے حدیث کے دوسرے حصے پر قیاس کیا ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچے جب دس سال کی عمر میں پہنچ جائیں تو نماز کے لئے ان کو مارو۔ چنانچہ شامی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اور بارہ سال انتہا قرار دینے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے بعد بلوغ کی عمر شروع ہو جاتی ہے یعنی بلوغ کی ابتداء اسی بارہ سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض لڑکے اس عمر میں بالغ بھی ہو جاتے ہیں اور فقہاء کرام نے بھی بلوغ کی کم تر مدت اسی بارہ سال کو قرار دیا ہے۔

لڑکے کے لئے بلوغ کی کم سے کم مدت بارہ سال ہے۔ (الدر المختار کتاب الحجر فصل بلوغ الغلام)

اور جن لوگوں نے طاقت پر اسے معمول کیا ہے اسے اشبہ اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ جس قدر جلد ہو جائے اچھا ہے تاخیر کی وجہ فقہاً صرف یہی ہو سکتی ہے کہ بچہ ختنہ کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکے اگر بچہ ساتویں دن اسے برداشت کر لیتا ہے اور تجربے سے یہ ثابت ہے تو پھر اسی دن مناسب ہوگا۔

ساری تفصیل پڑھنے کے بعد خاکسار جس نتیجہ تک پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ جلد سے جلد والی صورت اختیار کی جانی چاہئے اور اس کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمارے لئے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ آپؐ نے اپنے دونوں نواسوں کا ختنہ ساتویں دن کیا جیسا کہ حدیث نقل کی جا چکی ہے۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو اسی پر عمل عمدہ ہے۔ یوں ضروری نہیں ہے کہ دوسری حدیثیں بھی اس سلسلہ میں مروی ہیں۔ جیسا کہ اوپر نقل کی گئیں۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں۔

ختنہ کے وقت میں اختلاف ہے۔ شافعیہ بعد بلوغ کے قائل ہیں اور مستحب یہ ہے کہ پیدائش کے ساتویں دن کیا جائے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی ہوتی ہے جو آپؐ نے حضرت حسنؓ و حسینؓ کے لئے دیا تھا اور آپ کے ان دونوں نواسوں کا ختنہ پیدائش کے ساتویں دن ہوا تھا۔ حاکم نے یہ حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نقل کی ہے اور اس حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

(عمدۃ القاری للعینی۔ ج ۱۰ ص ۵۱۴)

علامہ عینیؒ کی اس صراحت سے جہاں خاکسار کے نظریہ کی تائید ہوئی، وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ ساتویں دن ختنہ مستحب ہے۔ گو گنجائش اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔

رہا عورتوں کے ختنہ کا مسئلہ، تو اس سلسلہ میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ ان کے لئے سنت نہیں ہے یوں اگر کر دیا جائے تو مضائقہ بھی نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔

عورتوں کا ختنہ سنت نہیں بلکہ مردوں کی عزت افزائی کے لئے ہے۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار مسائل شتی۔ ج ۵ ص ۷۳۴)

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بھی بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ عورتوں کا ختنہ سنت نہیں ہے جس طرح مردوں کا۔ البتہ بعض لوگوں نے مستحب لکھا ہے۔

بعضوں نے کہا کہ مردوں کا ختنہ سنت ہے اور عورتوں کا مستحب اس لئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کا ختنہ سنت ہے اور عورتوں کا موجب کرامت۔

(رد المحتار مسائل شتی۔ ج ۵ ص ۷۳۴)

حاصل یہ ہوا کہ عورتوں کا ختنہ مردوں کے اکرام کے لئے ہے مسنون نہیں ہے۔ عورتوں کا ختنہ کر دینے سے وہ مردوں کے لئے زیادہ مرغوب ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے چہرہ پر رونق آ جاتی ہے۔ اس لئے کہ ختنہ کے بعد عورتیں مجامعت میں لذیذ ترین بن جاتی ہیں۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۷۳۴)

ہندوستان میں عورتوں کے ختنہ کا رواج بالکل باقی نہیں رہا اور غالباً دوسرے ممالک میں بھی یہی حال ہے اور جب یہ ضروری بھی نہیں ہے اور نہ کوئی خاص فائدہ ہے تو اس کی کوئی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔

مرد کے ختنہ کی وجہ بیان کی جا چکی ہے کہ حشفہ جب تک صاف نکل نہیں آتا پیشاب کے قطرات اس اوپر کی جھلی میں رُک جاتے ہیں اور پاکی پورے طور پر حاصل نہیں ہو پاتی ہے اس لئے مردوں کے لئے ختنہ ضروری قرار دیا گیا پھر اسے شعار اسلام کا درجہ حاصل ہے۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ مرد اس سنت کو ہر حال میں اوا کریں۔

لیکن اگر کوئی بچہ اس طرح پیدا ہوا کہ اس کا حشفہ ظاہر ہے اس طرح کہ اگر کوئی دیکھے تو وہ اسے غیر مختون نہ سمجھے تو پھر اس کے ختنہ کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح اگر ختنہ میں پوری جھلی صاف طور پر کٹ نہ سکے مگر اکثر حصہ صاف ہو جائے تو پھر مزید دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

کوئی جوان یا بوڑھا شخص اسلام قبول کرے اور بغیر کسی خاص اذیت کے وہ اپنا ختنہ کر سکے تو اسے کر لینا چاہیئے لیکن اگر ایسی اذیت ہو جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تو ضروری نہیں ہے۔

جیسے بڈھا جو مسلمان ہو جائے اور بصیرت رکھنے والے کہیں کہ اس میں ختنہ کی طاقت نہیں تو اس کا ختنہ بھی ترک کر دیا جائے گا۔ (الدر المختار علی ہامش ردالمحتار مسائل شتیٰ ج ۵ ص ۴۳۴)

بالغ کے ختنہ سے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر اس کے لئے بطور خود ختنہ کرنا ممکن ہو، کر لے ورنہ چھوڑ دے اگر اسے کسی ایسی عورت سے نکاح ممکن ہو جو ختنہ کر سکے تو کر لے یا لونڈی خرید لے۔

(ایضاً کتاب الحظر والاباحۃ ج ۵ ص ۳۷۷)

جس کا ماحصل یہ ہوا کہ اگر کسی بالغ کو ختنہ کرانا ہے تو یا وہ خود کرے یا ممکن ہو تو وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو اس کا ختنہ کر سکے یا کسی ایسی لونڈی کو خریدے جو ختنہ کرنا جانتی ہو، مختصر یہ ہے کہ حتی الوسع اسے ختنہ کرانا چاہیئے۔

ظاہر یہ ہے بالغ ختنہ کرے اور ختنہ میں اکثر قلفہ کا کٹ جانا کافی ہے۔ (ایضاً)

ابن عابدین شامیؒ نے ختنہ کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ راہ خدا میں اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں، یہ ایک امتحان تھا جس میں ابراہیم علیہ السلام کو مبتلا کیا گیا تھا اور وہ کامیاب ہوئے، اس کی یادگار کے طور پر یہ ختنہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے لخت جگر کے خون میں ہاتھ بھگوئے گئے تھے۔ ہر شخص اپنے ایک حصہ کو کاٹ کر اور خون بہا کر ذرا سا چھوڑ دیا جائے اور اس امتحان سے گذر جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہر مسلمان اسلام کے حکم کے آگے اس طرح کی اذیت بخوشی برداشت کر سکتا ہے اپنے لئے بھی اور اپنے بچہ کے لئے بھی[1]

فقہاء نے اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اگر اس بچہ کی ملک میں مال نہ ہو جس کا ختنہ ہو رہا ہے تو یہ بار باپ برداشت کرے گا۔

بچہ کی ختنہ کی اجرت اس کے باپ کے ذمہ ہو گی اگر اس بچہ کی ملک میں نہیں ہے۔ (ایضاً مسائل شتیٰ ج ۵ ص ۴۳۳)

---

[1] ردالمحتار ص ۴۳۵، جلد ۵۔ ۱۲ ظفیر

اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ انبیاء کرام مختون پیدا ہونے کے سلسلہ میں اختلاف ہے یہ تو متفق علیہ ہے کہ کچھ انبیاء کرام مختون (ختنہ شدہ) پیدا ہوئے اختلاف اس میں ہے کہ کل انبیاء سوائے حضرت ابراہیم علیہ السلام مختون پیدا ہوئے یا چند مخصوص بعض علماء نے لکھا ہے کہ صرف چودہ انبیاء کرام مختون پیدا ہوئے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ حضرت آدمؑ علیہ السلام، شیثؑ علیہ السلام، نوحؑ علیہ السلام، لوطؑ علیہ السلام، صالحؑ علیہ السلام، شعیبؑ علیہ السلام، یوسفؑ علیہ السلام، موسیٰؑ علیہ السلام، سلیمانؑ علیہ السلام، زکریاؑ علیہ السلام، یحییٰؑ علیہ السلام، حنظلہ بن صفوان علیہ السلام (نبی اصحاب الرس) اور خاتم النبیینؐ حضرت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

صاحب الدر المختار نے علامہ سیوطیؒ کے حوالہ سے اس سلسلہ میں سترہ انبیاء کرام کا نام لیا ہے اور ان ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ حضرت ادریسؑ علیہ السلام، حضرت سامؑ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام[۱]

لیکن صاحب شرعۃ الاسلام سید علی زادہ نے لکھا ہے۔

مصنف کی طرف سے یہ آئے گا کہ انبیاء کرام کل کے کل مختون پیدا ہوئے اور ناف کٹے ہوئے، ان کی شرافت کے اظہار کے لئے تاکہ کوئی بھی ان کے ستر کو دیکھ نہ پائے۔ البتہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام مختون نہیں پیدا ہوئے انہوں نے خود اپنا ختنہ کیا تاکہ بعد والوں میں آپ کی یہ سنت جاری ہو سکے، لہٰذا صرف چودہ انبیاء کی تخصیص مناسب نہیں ہے۔ (شرح شرعۃ الاسلام ص ۳۰۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا تمام انبیاء کرام ختنہ شدہ پیدا ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس لئے مختون پیدا نہیں ہوئے کہ آپ سے اس ختنہ کی سنت رائج ہو اور دنیا میں آپ کے بعد یہ طریقہ جاری رہے۔

اوپر خاکسار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں دو روایات نقل کی ہیں۔ ایک میں ہے کہ اسّی سال کی عمر میں آپ نے اپنا ختنہ کیا، اور دوسری میں ہے کہ ایک سو بیس سال کی عمر میں۔ شامی نے ان دونوں کی تطبیق نقل کی ہے۔

دونوں میں تطبیق اس طرح دی گئی ہے کہ اسّی سال کی عمر نبوت سے ہوئی تھی اور ایک سو بیس پیدائش سے۔ (رد المحتار ج ۵ - ص ۲۷۵)

نیز ان دونوں میں اسّی سال والی روایت کو ترجیح دی ہے۔

۱۔ شرح شرعۃ الاسلام ص ۳۰۱ ۲۔ الدر المختار علی ہامش رد المحتار مسائل شتیٰ ص ۳۳ جلد ۵ - ۱۲

علامہ شامیؒ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کے سلسلہ میں اختلاف نقل کیا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے میں رواۃ و حفاظ کا اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں کوئی روایت صحیح نہیں ہے، اور امام حاکم کے اس قول کی امام ذہبی نے زوردار تردید کی ہے جس میں انہوں نے تواتر ثابت کیا تھا۔ ضعف بہرحال ثابت ہے اور محققین حفاظ نے کہا کہ درست کے قریب تر یہ ہے کہ آپ مختون نہیں پیدا ہوئے۔ (رد المحتار صفحہ ۴۲۳۔ جلد ۵)

علامہ شامیؒ کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختون پیدا ہونا مسلّم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

(یہ نہیں بتایا گیا کہ اس باب میں ان حضرات کا ذریعۂ علم کیا تھا؟ یعنی انہیں کس طرح معلوم ہوا کہ (مثلاً) حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ مختون پیدا ہوئے تھے۔ طلوعِ اسلام)

نقد و نظر

مضامین سرسیدؒ

اُردو اکیڈمی سندھ (کراچی) نے اُردو زبان میں ارزاں قیمت پر معیاری ادب پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اسی کی ایک اہم کڑی سرسید علیہ الرحمۃ کے آٹھ مضامین پر مشتمل ڈیڑھ سو صفحات کا یہ زیرِ نظر کتابچہ ہے جو دیدہ زیب اور ارزاں بھی ہے اور ساتھ ہی کئی ایک لحاظ سے مفید بھی۔ اصلاح و ترقی کے ایک عظیم داعی کی حیثیت سے سرسیدؒ نے اپنی زندگی میں جو کچھ لکھا وہ ہزاروں صفحات پر محیط ہے اُردو ادب میں وہ ایک جدید طرزِ نگارش کے بانی تھے اور ہر اہم سے اہم موضوع کو انتہائی سلیس، سادہ اور دلنشین انداز میں پیش کرنا ان کی تحریروں کا امتیازی پہلو تھا۔ انہوں نے اپنے دَور کے مروجہ ادبی تکلّفات سے بالاتر ہو کر ایسا اندازِ تحریر ایجاد کیا جس کی بے ساختگی فکر و نظر کی گہرائیوں تک اثر انداز ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ انہوں نے ہر موضوع کی نوعیت کی مناسبت سے وہی زبان اختیار کی جو حسبِ حال بھی تلی نظر آئے۔ مضامین سرسیدؒ کا زیرِ نظر انتخاب مختلف موضوعات پر ان کے اسی ادبی کمال کا آئینہ دار ہے۔ وہ ہر موضوع پر ایک دوسرے سے مختلف اندازِ تحریر اختیار کرتے ہیں لیکن وہی

جو اپنے مقام پر بدرجہ مناسب، انوکھا، جدید اور دل نشین محسوس ہو۔ سرسید کی علمی، تاریخی، سیاسی اور مذہبی کاوشوں اور افکار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی تمام تحریریں ملّت کے ایک عظیم

ریفارمر اور حکیم الانقلاب کی مخلصانہ تڑپ اور خلش کی ترجمان ہیں۔ یہ کتابچہ اردو اکیڈمی سندھ نے مشن روڈ کراچی سے شائع کیا ہے۔ اور قیمت سوا روپیہ ہے۔

مقالات شبلی

اردو اکیڈمی کا یہ دوسرا کتابچہ ہے جو مولانا شبلی نعمانی کے تین تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان مقالات میں اسلامی حکومت کے ہندوستانی تمدن پر اثرات، سرسید مرحوم کی اردو ادب میں خدمات اور مسلمانوں کی عہدِ رفتہ کی تعلیمی کارفرمائیوں پر مخصوص تحقیقی انداز سے بحث کی گئی ہے۔ سرسید کی طرح مولانا شبلی کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے۔ اردو اور فارسی شاعری سے کہیں آگے بڑھ کر انہوں نے سوانح اور تنقید میں نام پیدا کیا اور اس لحاظ سے تاریخی تحقیقات پر مشتمل ان کے مقالات اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ قرار پاتے ہیں۔ اس کتابچہ میں مشمولہ مقالات بھی اپنی افادی نوعیت کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہیں اور ایک سو بیس صفحات کا یہ خوبصورت کتابچہ اس لحاظ سے سوا روپیہ ہیں گراں نہیں۔

ایک غلطی کی تصحیح

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (ماہ دسمبر) میں نقد و نظر کے زیرِ عنوان (صفحہ ۱۶ پر) "ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء" پر تبصرہ میں محترم مترجم مولانا عبدالشکور صاحب کے نام کے ساتھ غلطی سے (مرحوم) چھپ گیا ہے۔ مولانا بفضل ایزدی ابھی بقیدِ حیات ہیں ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے۔

"خود فیصلہ کیجئے"

حدیث کے موضوع پر ایک عجیب و غریب پمفلٹ ہے جسے پڑھنے کے بعد انسان پر عجیب حقائق منکشف ہوتے ہیں اور وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اسکی قیمت صرف دو آنے ہے۔ بہتر ہو کہ آپ آٹھ پمفلٹ منگالیں۔ خود بھی پڑھیں اور دوسروں تک بھی پہنچادیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور